ماہنامہ
جولائی 2023ء
طلوعِ اسلام
لاہور
اشاعت کا اِسی واں سال

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ (الحدیث)
حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے



علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ
کی خواہش پر 1938ء سے شائع
ہونے والا ماہنامہ

هُوَ الَّذِیْ یُرِیْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّیُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ﴿۱۲﴾ (13:12)

(تباہیوں کی ایسی یاس انگیز حالت میں، قانونِ خداوندی کی طرف رجوع کرنے کی اُمید افزا کیفیت کا اندازہ کرنے کے لئے تم پھر کائنات میں غور کرو کہ ایک ہی حادثہ میں کس طرح، بیم و رجا، ملے جلے ساتھ آتے ہیں۔) تم دیکھو کہ بجلی چمکتی ہے تو اس سے خوف و ہراس پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی، پانی سے بھرے ہوئے بادل اُمنڈے ہوئے چلے آتے ہیں جو تمہارے لئے نفع بخشیوں کے پیغام بر ہوتے ہیں۔ (مفہوم قرآن از علامہ پرویزؒ)

اس شمارے میں:

- ابلیس اور نیکی کے کام — 4
- درسِ قرآن (سورۃ آلِ عمران، آیات 59 تا 63) — 6
- اختلافِ قرأت کا افسانہ — 27
- نظریۂ مادیت انسان کی جسمانی اور حیوانی زندگی — 51
- اللہ تک رسائی بذریعہ قرآن اور اسوۂ حسنہ — 56
- The Human Self and Allah — 59



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مذہب اور دینِ اسلام کا تقابلی جائزہ

یورپ نے غالباً مانی کے عقیدے سے روح کو مادہ کی ثنویت کا خیال اخذ کیا اور بلا تنقید اسے قبول کر لیا۔ اسی نظریہ کی بنیاد پر انہوں نے مذہب (Religion) اور سیاست (State) کی ثنویت کا تصور پیش کیا۔ قرآنِ کریم میں مذہب کا لفظ ہی کہیں نہیں آیا۔ اس لئے اسلام کو مذہب نہیں بلکہ قرآن کے دیئے ہوئے دین کے نام سے پکارنا چاہئے۔ إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الإِسْلاَمُ (3:19)۔

مذہب	دینِ اسلام
1- مذہب، خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق اور داخلی تجربہ کا نام ہے۔	دین اجتماعی نظام زندگی اور خارجی حقیقت ہے۔
2- مذہب میں ہر فرد اپنے طور پر مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس کا خدا کے ساتھ رشتہ قائم ہو گیا ہے۔	دین میں معاشرہ کا انداز اور آئین بتا سکتے ہیں کہ وہ قوانین خداوندی کے مطابق متشکل ہوا ہے یا نہیں۔
3- مذہب میں ہر فرد کا منتہیٰ اپنی اپنی نجات ہوتا ہے۔	دین کا مقصود عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود ہوتا ہے۔
4- مذہب میں کوئی خارجی معیار ایسا نہیں ہوتا جس سے پرکھا جا سکے کہ انسان کے اعمال صحیح نتائج پیدا کر رہے ہیں یا نہیں۔	دین میں اجتماعی زندگی کے نتائج ساتھ کے ساتھ بتاتے چلے جاتے ہیں کہ ملت صحیح راستے پر چل رہی ہے یا نہیں۔
5- مذہب انسان کو مختلف فرقوں میں تقسیم کر دیتا ہے اور اس میں ہر فرقہ اپنے آپ کو حق پر سمجھ کر خوش ہوتا ہے۔	دین میں تفرقہ کو شرک کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ پوری نوع انسانی سے مخاطب اور اس کا رب، رب العالمین اور رسول رحمۃ للعالمین کا مقام رکھتے ہیں۔
6- مذہب عوام کے جذبات کے پیچھے چلتا ہے اور ان کی تسکین کا سامان فراہم کئے چلا جاتا ہے۔ اس لئے اس کی تعلیم یہ ہے۔ زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز	دین، انہیں حقائق کے پیچھے چلاتا ہے اور ان کے سطحی جذبات کی تسکین کی بجائے ان پر قابو پانے کی تعلیم یوں دیتا ہے۔ زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز
7- مذہب انسان کے دل میں ہر وقت خوف پیدا کرتا رہتا ہے اور اپنی ہر بات ڈر سے منواتا ہے۔	دین خوف کو شرک قرار دیتا ہے اور انسان کے دل کو جرأت اور بے باکی کا مسکن بناتا ہے۔

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ
طلوعِ اسلام لاہور
جولائی 2023ء

جلد 76 شمارہ نمبر 07

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
ابلیس اور نیکی کے کام	ادارہ	4
درسِ قرآن (سورۃ آلِ عمران، آیات 59 تا 63)	پرویز علیہ الرحمۃ	6
اختلافِ قرأت کا افسانہ	جمیل احمد عدیل	27
نظریۂ مادیت انسان کی جسمانی اور حیوانی زندگی	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	51
اللہ تک رسائی بذریعہ قرآن اور اسوۂ حسنیٰ	محمد انوار خان، اسلام آباد	56

چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر اعجاز رسول
اقبال ادریس ایڈووکیٹ

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِتعاون: 50 روپے فی پرچہ
پاکستان: 600 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ

ENGLISH SECTION

The Human Self and Allah
By G. A. Parwez (Translated by: Dr. Ejaz Rasool)
Episode No. 18 — 59

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: +92 310-4800818
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا!
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے
حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبع بلندے، مشرب نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

ابلیس اور نیکی کے کام

تصوّف کی کتابوں میں پڑھا تھا کہ ایک بہت بڑے پیر صاحب نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ ایک خضر صورت بزرگ ان سے کہہ رہے ہیں کہ اس مرتبہ حجِ اکبر ہو رہا ہے اور تم سو رہے ہو۔ اٹھو اور حج کی تیاریاں کرو۔ انہوں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اٹھ کر اپنے ارادۂ سفرِ حج کا اعلان کر دیا۔ یہ سن کر ان کے لاکھوں مرید بھی حج کی تیاریاں کرنے لگ گئے کہ ایک تو حج بھی حجِ اکبر اور دوسرے مرشد کی معیت اور اقتداء! یہ تحریک ملک گیر ہو گئی تو ان پیر صاحب کے مرشد نے ان سے کہا کہ یہ تم نے کیا پروگرام بنا لیا ہے؟ انہوں نے اپنے خواب کا ماجرا سنایا تو مرشد نے کہا کہ تمہیں معلوم ہے وہ بزرگوار کون تھے؟ وہ ابلیس تھا۔ انہوں نے کہا کہ یا حضرت! ابلیس کا کام تو نیک کاموں کے راستے میں روڑے اٹکانا ہے، اور اس نے مجھے حج پر جانے کے لیے بیدار کیا۔ یہ ابلیس کا کام کیسے ہو سکتا ہے؟ مرشد نے کہا کہ خلیفۂ وقت نے جہاد کا اعلان کیا ہے۔ ابلیس نے تمہیں حج کی طرف الجھا دیا ہے کہ تم اور تمہارے لاکھوں مرید، جہاد میں حصہ نہ لے سکیں۔

یہ حکایت بڑی عظیم حقیقت کی پردہ کشا ہے۔ نیک نیت لوگوں کو زندگی کے بلند مقاصد (دین) کی طرف سے غافل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انہیں چھوٹے چھوٹے ''نیکی کے کاموں'' میں الجھا دیا جائے اور اس طرح انہیں اس فریبِ نفس میں مبتلا کر دیا جائے کہ وہ بہت بڑے کارنامے سرانجام دے رہے ہیں۔ قرآنِ کریم نے فریبِ نفس (شیطانی عمل) کا نتیجہ یہ بتایا ہے کہ اَفَمَنۡ زُیِّنَ لَہٗ سُوۡٓءُ عَمَلِہٖ فَرَاٰہُ حَسَنًا ؕ (35/8) انسان کو اس کے غلط کام بھی بڑے جاذب اور حسین بن کر دکھائی دیتے ہیں۔ ابلیس کی یہ ٹیکنیک ہر جگہ کامیاب ہو یا نہ ہو، لیکن مذہب کی دنیا میں اس کی یہ ٹیکنیک ہمیشہ کامیاب رہتی ہے کہ فعال اور نیک نیت افراد، کی نگاہوں سے زندگی کے بلند مقاصد اوجھل کر کے، انہیں ظاہر پرستی میں الجھا دیا جائے۔ قرآن کریم نے اس غلط نگہی اور خود فریبی کا پردہ چاک کرنے کے لیے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا کہ ''اصل نیکی یہ نہیں کہ تم مشرق کی طرف منہ کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ اصل نیکی قرآنِ کریم کی ابدی صداقتوں پر ایمان لانے کے بعد اپنے مال و دولت کو اس کی

کشش وجاذبیت کے باوجود، دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لیے، دیدینے میں ہے۔ یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ، کے نظام کا نام ہے۔ یہ اپنے قول واقرار اور عہد و پیمان پورا کرنے کا نام ہے اور اس کا راز اس میں ہے کہ تم مخالفین کے مقابلہ میں کس قدر استقامت وثبات سے کام لیتے ہو۔ یہ ہے دعویٰ ایمانِ کی صداقت کا ثبوت، یہ ہے اصلِ تقویٰ (2:177) اس وقت امتِ مسلمہ پوری کی پوری، موت اور حیات کی کشمکش میں گرفتار ہے۔ جن لوگوں کے دل میں اسلام کا اور ملت کے ساتھ غم گساری کا جذبہ، خلوص اور ایثار کے جوہر موجود ہیں، ان کا اولین فریضہ یہ ہے کہ وہ دشمنوں کی مخالفتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے منظم ہوجائیں۔ لیکن یہ حضرات ایسے نازک وقت میں، اس قسم کے ''نیکی کے کاموں'' میں مصروف ہورہے ہیں اور ساری قوم کو دعوت دے رہے ہیں کہ وہ بھی، اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ، اس قسم کے ''ثواب کے کاموں'' میں منہمک ہوجائیں۔ اقبال نے اپنی معرکہ آرا نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' میں اس حقیقت کو بڑے دل آویز اور بصیرت افروز انداز میں منکشف کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ جب ابلیس کے مشیروں نے اس سے یہ خطرہ ظاہر کیا کہ امتِ مسلمہ میں کچھ کچھ بیداری کے آثار نمودار ہورہے ہیں۔ ہمیں کیا کرنا چاہئے جس سے یہ قوم بدستور محوِ خواب رہے۔ تو اس نے اس کے لیے جو پروگرام تجویز کیا اس میں اُن سے کہا کہ ؎

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مُہرے ہوں مات

اور اس کے لیے کرنے کا کام یہ ہے کہ:

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اِسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اِسے

اُمت کے مخلص ایثار پیشہ فعال طبقہ کو ''ذکر وفکرِ صبحگاہی'' میں الجھا دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ بساطِ زندگی میں اس کے سب مُہرے مات ہوجائینگے۔

اس امت کے ساتھ صدیوں سے یہی ہوتا چلا آرہا ہے اور آج بھی یہی ہورہا ہے۔

وہی دیرینہ بیماری، وہی نا محکمی دل کی

اور

علاج اس کا وہی ''آبِ نشاط انگیز'' ہے ساقی

پرویز علیہ الرحمۃ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

درسِ قرآن

سورۃ آلِ عمران، آیات 59 تا 63

اِنَّ مَثَلَ عِیۡسٰی عِنۡدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَہٗ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ﴿۵۹﴾ اَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ فَلَا تَکُنۡ مِّنَ الۡمُمۡتَرِیۡنَ ﴿۶۰﴾ فَمَنۡ حَآجَّکَ فِیۡہِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَکَ مِنَ الۡعِلۡمِ فَقُلۡ تَعَالَوۡا نَدۡعُ اَبۡنَآءَنَا وَاَبۡنَآءَکُمۡ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَکُمۡ وَاَنۡفُسَنَا وَاَنۡفُسَکُمۡ ۟ ثُمَّ نَبۡتَہِلۡ فَنَجۡعَلۡ لَّعۡنَتَ اللّٰہِ عَلَی الۡکٰذِبِیۡنَ ﴿۶۱﴾ اِنَّ ہٰذَا لَہُوَ الۡقَصَصُ الۡحَقُّ ۚ وَمَا مِنۡ اِلٰہٍ اِلَّا اللّٰہُ ؕ وَاِنَّ اللّٰہَ لَہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۶۲﴾ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌۢ بِالۡمُفۡسِدِیۡنَ ﴿۶۳﴾

قرآنِ حکیم کی تعلیم کے برعکس غلو کی بنا پر حضرت عیسیٰؑ کی عقیدت مندیوں کا نتیجہ اور ہماری حالتِ زار

عزیزانِ من!

آج نومبر 1969ء کی 30 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ آلِ عمران کی آیت 58 سے ہوتا ہے (3:58)۔

قرآنِ حکیم کے مطابق ہر کسی رسول کے خلاف کہی ہوئی غلط بات کی تردید کرنا ہمارا فرض ہے:

سابقہ آیات میں ان الزامات کی تردید کی گئی تھی جو یہودیوں کی طرف سے حضرتِ مریمؑ اور حضرتِ عیسیٰؑ کے خلاف عائد کیے جاتے تھے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا بظاہر عیسائیوں کا ایک نبی یہودی اس کے خلاف الزامات عائد کرتے ہیں اور قرآن ان کی تردید کرتا ہے۔ اور اس انداز سے تردید کرتا ہے کہ خود عیسائی بھی ایسی تردید نہیں کر سکے تھے۔ اور یہ اسی لیے کہ نبی نہ کوئی عیسائیوں کا ہوتا ہے نہ یہودیوں کا ہوتا ہے نہ مسلمانوں کا ہوتا ہے۔ یہ انبیائے کرامؑ تو خدا کے ہوتے ہیں سارے ہی خدا کی طرف سے آئے تھے اسی کا پیغام لے کر آئے تھے۔ اس لیے قرآن کو ماننے والوں کو تو یہ کہا گیا لَا نُفَرِّقُ بَیۡنَ اَحَدٍ مِّنۡ رُّسُلِہٖ (2:285) ہم ان میں سے رسالت کی حیثیت سے کسی ایک میں بھی تفریق نہیں کرتے۔ لہٰذا ہم اگر ان الزامات کی تردید کرتے ہیں قرآن کی روشنی میں، عیسائیوں کے نبی کی نہیں کرتے خدا کے ایک رسول کے خلاف خدا کے پیغام کے

دشمنوں کی طرف سے جو کچھ کہا جا رہا ہے اس کی تردید کرتے ہیں۔ اور اس اعتبار سے آپ دیکھیے کہ ہمارے ذمے تو دنیا بھر کے انبیا کی خواہ ان کا ذکر قرآن نے تصریحاً کیا ہے یا نہیں کیا ان کی مدافعت ہمارے لیے جزوِ ایمان ہو جاتی ہے۔ اتنی بڑی TOLERENCE ہی نہیں BROAD MINDEDNESS ہے کشادگیٔ ظرف ہے۔ اور اس کا کسی پر احسان نہیں کہ ہم انہیں انہی جیسا بلکہ ان سے بہتر نبی تسلیم کرتے ہیں۔ وہ تو انبیا کے خلاف پوچھو نہیں تورات میں آپ دیکھیے کیا کچھ لکھا ہوا ہوتا ہے ہمیں اس کی بھی تردید کرنی ہوتی ہے۔ پہلا جزو جو تھا وہ ان الزامات کی تردید میں گذرا۔ اگلا جزو آیا۔

انسانی زندگی کے تحفظ کو الزام تراشی اتنا نقصان نہیں پہنچاتی جتنا غلو اور مبالغہ گوئی پہنچاتی ہے:

قرآنِ کریم نے ان لوگوں سے کہا تھا کہ تم اپنے انبیا یا بزرگوں کی شان میں غلو نہ کیا کرو مبالغہ نہ کیا کرو۔ آپ دیکھیے کہ جس طرح سے کسی کے خلاف جھوٹا الزام اس کی صحیح پوزیشن نہیں رہنے دیتا اسی طرح سے اس کی پوزیشن کے متعلق مبالغہ جو ہے وہ بھی اس کی صحیح پوزیشن نہیں رہنے دیتا۔ وہ اگر تفریط ہے تو یہ افراط ہے۔ قرآن مبالغے سے منع کرتا ہے۔ اور یہ آپ دیکھیں گے کہ الزامات تو کہیں کہیں عائد ہوتے ہیں مبالغہ قریباً ہر بزرگ کی شان میں ہوتا ہے۔ اور قرآن مبالغے سے بھی اسی شدت سے منع کرتا ہے جس شدت سے وہ جھوٹے الزامات سے منع کرتا ہے۔ وہ ہر انسان کو اس کے صحیح مقام پر رکھنا چاہتا ہے۔ اور یہی اس کا صحیح شرف ہے کہ اس کو صحیح مقام پر رکھا جائے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ جتنا غلو اور مبالغہ کسی کو مارتا ہے نا الزام تو ایسے مارتا ہی نہیں ہے۔ الزامات کی تردید بڑی آسان ہے یہ جو علوِ مرتبت مبالغے کی بنا پر کسی کو عطا کیا جاتا ہے اس کے خلاف آپ لب کشائی کیجیے دیکھیے کس طرح سے بھڑوں کے چھتے میں پتھر مارنے کی بات ہو جاتی ہے۔ انبیا کے متعلق جس طرح سے مبالغے سے کام لیا گیا ہے اس کے متعلق کوئی ایک لفظ کیجیے اور ان کو صحیح مقام پہ لایئے تو کفر الحاد کے فتوے۔ کہہ دیجیے کہ رسول اللہ ﷺ بشر تھے پھر دیکھیے ہوتا کیا ہے؟ وہ تو خیر حضور ﷺ کا مقام ہے کسی سائیں لسوڑی شاہ کے متعلق کہہ دیجیے کہ نہیں جی وہ تو ایسے انسان تھے جیسے اور ہوتے ہیں پھر دیکھیے کہ ان کے حلقۂ مریدین جو ہیں کیا کچھ کرتے ہیں آپ کے ساتھ؟ اینٹ اور پتھر کا یہ جو چبوترہ ہوتا ہے جسے آپ قبر کہتے ہیں میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ قبر کی طرف پیٹھ کر کے چلنے والا جو ہے وہیں اس کو پکڑ کے ڈھیر کر دیا۔۔ اتنی گستاخی یعنی حضرت صاحب کی شان میں نہیں ان پتھروں کی شان میں جنہوں نے حضرت صاحب کو دبایا ہوا ہے۔

روم کے ایک گرجے میں حضرت عیسیٰؑ کی تصویر اور عقیدت کی موم بتیوں کا دھواں:

یہ کیا چیز ہے؟ کیا عجیب تعلیم ہے قرآن کی جب وہ کہتا ہے ان سے کہ غلو مت کرو۔ جتنی حقیقتیں غلو کے اندر مستور ہوتی ہیں الزامات میں تو نہیں ہوتیں۔ روم کے سب سے بڑے گرجے میں حضرتِ عیسیٰؑ کی ایک تصویر ہے مائیکلو اینگل کی تصویر کہتے ہیں بہترین تصویر' اس کے نیچے ان کے معتقدین اپنی عقیدت کی موم بتیاں جلاتے ہیں۔ تو ایک عرصے کی موم بتیوں کا

جو دھواں ہے انہوں نے اس تصویر کے اوپر ایک پورا COATING کر رکھا ہے وہ تصویر ان عقیدت کی شمعوں کے دھوئیں کے نیچے دب کے رہ گئی ہے۔ ہر بڑی ہستی کی صحیح تصویر جو ہے ان کے عقیدت مندوں کی موم بتیوں کے دھوئیں کے نیچے دب کے رہ جاتی ہے۔ اور پھر وہ دھواں اور چیکٹ اتنا متبرک اور مقدس ہو جاتا ہے کہ کوئی اگر اس کو ہٹانے کا' چھیڑنے کا' کریدنے کا ذرا سا بھی قصد کرے تو اس کے ہاتھ کاٹ دیے جاتے ہیں۔

عیسائیوں کی تمام تر تعلیم کا تمام تر تصور حضرت عیسیٰؑ کے بن باپ پیدا ہونے پر ہے:

عزیزانِ من! یہ وجہ ہے کہ قرآنِ کریم ہر بڑے انسان کو اس کے صحیح مقام پر رکھتا ہے اور یہی اس کا صحیح احترام ہے۔ الزامات کے دائرے سے آگے بڑھے تو اب وہ دائرہ آیا جہاں غلو نے حضرتِ عیسیٰؑ کو ان کے مقام سے الگ ہٹا دیا تھا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ مقام وہ ہے کہ جہاں آپ احباب سے بھی میں یہ کہوں گا کہ ذرا اعتدال اور توازن کو قائم رکھ کے بات سنیے۔ الزامات کی تردید تو میں نے کی تو اس سے آپ بھی متفق تھے اب یہ جو مقام آ رہا ہے غلو اور مبالغے کا اس میں صدیوں کے غلط معتقدات نے ہمیں بھی اس مقام پر پہنچا دیا ہے کہ غلو کے خلاف ہم بھی کچھ سننا برداشت نہیں کر سکتے۔ یہ جتنی لڑائیاں اور جھگڑے ہوتے ہیں یہ سب اس وجہ سے ہوتے ہیں کہ ایک گروہ نے اپنے کسی بڑے کے شان میں جو مبالغہ کر رکھا ہوتا ہے دوسرا گروہ اس مبالغے سے ذرا نیچے اترتا ہے تو اس پہ تنقیص یا تنکیر سمجھی جاتی ہے کہ گستاخی کر رہا ہے یہ ان کی شان میں۔ اور یہ جو معاملہ ہے حضرتِ عیسیٰؑ کا ان کے متعلق تو خاص طور پہ مسلمان بہت ہی ٹچی ہو گیا ہوا ہے حالانکہ اس کی وجہ کوئی نہیں تھی۔ عیسائیوں کے مذہب کی ساری عمارت اسی مبالغے کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ حضرتِ عیسیٰؑ بن باپ کے پیدا ہوئے پوری نوعِ انسانی میں ایک EXCEPTION بہت بڑی چیز ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کے متعلق مسلم دنیا میں پائے جانے والے تصور کی بنیاد اور پھر شدتِ جذبات کی کیفیت:

وہ زندہ آسمان پہ اٹھائے گئے ساری نوعِ انسانی میں ایک EXCEPTION۔ بہت بڑی چیز ہے۔ تو عام انسانوں سے جسے اس طرح سے الگ کیا جائے اب اس کے لیے بن باپ کے پیدا ہوئے ابن اللہ خدا کا بیٹا۔ جس کی پیدائش عام انسانوں جیسی نہیں جس کی موت عام انسانوں جیسی نہیں وہ سپر ہیومن کیوں نہیں بنے گا؟ وہ عام انسانوں سے بلند مقام کیوں نہیں رکھے گا؟ اسی لیے عیسائیت نے انہیں مقامِ الوہیت عطا کر دیا۔ یہ پہلی بنیاد اگر تسلیم کر لی جائے تو اس کے اوپر جو عمارت استوار ہوتی ہے اس کی آپ تردید ہی نہیں کر سکتے۔ کیا کہیں گے انہیں کس طرح سے آپ انسان کہیں گے؟ وہ زندہ آسمان پہ اٹھانے کے بعد تو پھر جب یہ اعتراض ہوا تو اس کے لیے آپ نے پھر یہ کیا وضع کہ نہیں صاحب! ان کو پھر آسمان سے اتارا جائے گا اور اس کے بعد ان کو پھر موت آئے گی۔ یہ اس اعتراض کا جواب ہے جو آپ کے اوپر وارد ہوتا تھا۔ لیکن یہ

جوعقیدہ پہلے آ گیا آپ کے ہاں کہ پیدائش بھی خارقِ عادت ہے عام انسانوں کی سی نہیں ہے اس کا تو جواب ہی آپ کے پاس نہیں ہے۔عیسائیوں کے خلاف اگر آپ اعتراض کوئی کر سکتے تھے تو یہی دو چیزیں تھیں کہ تم نے مبالغہ کیا ہے اپنے نبی کی شان میں تا کہ تم اس کو خدا کو بنا سکو۔وہ انسان تھے خدا کے رسولؑ تھے اسی میں ان کی عظمت تھی اس کا ان کے پاس جواب نہیں ہوسکتا تھا۔اور اس کے لیے جیسا کہ آپ کے ہاں ہوا یہ ان کے عقائد آپ کے ہاں کی روایات کے اندر آ گئے۔آپ کے قرآن کی تفسیریں ان روایات کی رو سے ہونے لگ گئیں اور بین ہی یہی عقیدہ جو تھا مسلمانوں کا عقیدہ بن گیا۔اب عیسائیوں کو ضرورت ہی نہیں رہی کہ حضرتِ عیسیٰؑ کے متعلق اپنے عقائد کو صحیح ثابت کریں آپ خود انہیں صحیح مانتے ہیں۔اور اتنی شدت سے صحیح مانتے ہیں کہ آپ کے ہاں یہی عقائد جزوِ ایمان بن گئے ہیں۔کسی شخص کے متعلق یہ کہا جائے کہ صاحب! یہ کہہ رہا ہے حضرتِ عیسیٰؑ کا اسی طرح باپ تھا تو آپ دیکھتے ہیں کہ طبیعت REVOLDE کرتی ہے اِبا کرتی ہے۔اور پھر کفر کا فتویٰ وہ تو جھٹ سے عائد ہوتا ہے۔یا اگر کسی کے متعلق کہیے کہ یہ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! حضرتِ عیسیٰؑ نے وفات پائی تھی تو اس کے خلاف آپ دیکھیے کیسا شور مچ جاتا ہے؟ یہ کیا چیز ہے؟ عیسائی اگر اسے نہیں مانتا کہ وہ باپ سے پیدا ہوئے تھے یا وفات پا گئے تھے وہ عیسائیت کے دائرے سے خارج ہوجاتا ہے۔عیسائیت کے لیے تو یہ ایمان کا حصہ ہے بلکہ ایمان ہے عین ان کا ۔کمال یہ ہے کہ مسلمان اگر اس عقیدے کو نہیں مانتا تو وہ اسلام کے دائرے سے خارج ہوجاتا ہے۔آپ کے ہاں یہ چیز کہاں جزوِ ایمان تھی؟ کہاں تھا یہ لکھا قرآن میں؟ کہ جو شخص یہ چیزیں دو نہیں مانے گا وہ اسلام کے دائرے سے خارج ہوجائے گا۔ قرآن نے تو ان انبیا کی رسالت پر ایمان لانے کے لیے کہا ہے صرف' اتنا ہی منواتا ہے وہ کہ انہیں آپ خدا کا رسول مانیے۔ یہ کہاں اس نے یہ لکھا ہے کہ ان کے متعلق یہ بھی مانیے کہ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے اور آسمان پہ زندہ چلے گئے تھے؟ زیادہ سے زیادہ آپ اس کو ایک مسئلے کی حیثیت دے سکتے ہیں۔چلیے کسی نے اس طرح سے سمجھ لیا یوں سمجھ لیا دوسرے نے اس کے خلاف سمجھ لیا اس کو کہیے کہ تم نے یوں سمجھ لیا۔لیکن نہیں۔

صدیوں سے ہمارے ہاں حیات و وفاتِ مسیحؑ کے مسئلہ پر مخاصمت کی نوعیت اور مناظرے:

جیسا میں نے عرض کیا اس کی حیثیت آپ کے ہاں عقیدے کی' نظریے کی' خیال کی نہیں رہی یہ ایمان کا جزو بنا دیا گیا ہے۔اور نظر آتا ہے کہ اس کے اندر کتنی بڑی عیسائیوں کی ایک گہری سازش تھی کہ آپس میں ہمارے ہاں اس مسئلے پہ سر پھٹول ہو رہی ہے جو ہمارے ہاں مخاصمت کے جس ایشو پہ ہونی چاہیے تھی۔یہاں ہزار برس سے آپ کے ہاں وفات وحیاتِ مسیحؑ اتنا اہم مسئلہ ہو گیا ہوا ہے کہ آج کل تو خیر اس قوم کو ایسی افراتفری پڑی ہوئی ہے کہ یہ چیزیں پھر بھی ذرا پیچھے بیک گراؤنڈ میں چلی گئی ہیں ورنہ اس سے پیشتر جب یہ مسائل ان کے ہاں ابھی نہیں آئے تھے یہ مسائل اتنی اہمیت اختیار کر چکے ہوئے تھے۔ہم نے اپنے ہاں اپنے بچپن میں بلکہ اس کے بعد کی جوانی کے عالم میں بھی اس قدر مناظرے اس قدر مباحثے پوچھو نہیں کیا ہوتا تھا ؟ یہ چیزیں اس طرح سے انسان کے غیر شعوری طور پر اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں کہ ان کے خلاف پھر وہ

ایک لفظ سننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے الزامات کی آپ تردید کیجیے ہر شخص خوش ہوگا مبالغے کو آپ ہٹا کے صحیح مقام پہ لانے لگئے ہر شخص آپ کے گلے پہ ہاتھ ڈال دے گا۔ عزیزانِ من! لہٰذا جہاں معاملہ مبالغے کا آئے وہاں ذہنی توازن کو برقرار رکھنا بڑا ہی ضروری ہوجاتا ہے اس کا تعلق انسان کے جذبات سے ہوتا ہے فکر سے نہیں ہوتا۔ اور جہاں جذبات کے مقام آتے ہیں وہاں اقبالؒ کے الفاظ میں کہ

مقامِ ہوش سے آساں گذر گیا اقبالؒ
مقامِ شوق میں کھویا گیا یہ دیوانہ

قرآنی حقائق تو انسانی جذبات کی شدت کو مبالغے کی حدود میں داخل ہونے ہی نہیں دیتے:

عزیزانِ من! یہ مقامِ شوق ہوتے ہیں جہاں جذبات آجاتے ہیں۔ اس لیے یہاں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اور مسلمان کے لیے تو احتیاط کہیں مانگ کے لانے کی بات نہیں' قرآن جب اس کے سامنے ہو تو اس کے بعد وہ تو خود آپ کو ایسے احتیاطوں کے CHANNELS ساحلوں کے اندر لے جاتا ہے کہ آپ نہ مبالغے کی طرف جاسکتے ہیں نہ الزامات کی طرف جاسکتے ہیں۔ لہٰذا جو شخص قرآن پیش کرتا ہے وہ جس طرح سے ان الزامات کو قرآن کی روشنی میں تردید ان کی کرتا چلا جاتا ہے ان مبالغوں کو بھی اسی طرح سے وہ ہٹا کر اس کو صحیح مقام پہ لاتا ہے وہ مقام جو قرآن نے عطا کیا ہے۔ کسی کو اس سے اختلاف ہو تو اسے یہیں تک سمجھنا چاہیے کہ اس کا ایک مسئلہ ہے اس کے متعلق وہ کچھ اور سمجھتا ہے یہ شخص کچھ اور سمجھتا ہے اس سے زیادہ ان مسائل کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ عزیزانِ من! حضرتِ عیسیٰؑ کو جو بن باپ کے مانتے ہیں اس سے نہ ان کی رسالت میں عظمت پیدا ہوتی ہے۔ اور جو یہ مانتا ہے کہ نہیں! وہ عام حالات میں اسی طرح پیدا ہوئے تھے جیسے دوسرے انسان پیدا ہوتے ہیں اس سے ان کی رسالت میں کوئی کمی نہیں واقع ہوتی۔ اور ایمان ہم نے ان کی رسالتؑ پہ لانا ہے ان چیزوں پہ ایمان نہیں لانا۔ یہ دلیل کہ صاحب! خدا اس پہ قادر ہے یا نہیں یہ تو کوئی QUESTION ہی نہیں کرسکتا۔ جو خدا اس پہ قادر ہے کہ اس پوری کائنات کو عدم سے وجود میں لاسکتا ہے NON EXISTENCE سے EXISTENT کرسکتا ہے بغیر کسی مسالے کے بغیر کسی میٹریل کے۔ جہاں تک اس کا تعلق ہے کہ وہ قادر ہے یا نہیں قدرت کا سوال اس میں کہاں پیدا ہوتا ہے؟ ہر چیز پہ قادر ہے کرسکتا ہے۔ سوال یہ وہ کہتا یہ ہے کہ ہم کرتے نہیں ہیں۔ کسی کا کرسکنا اور اس کا نہ کرنا یہ نہ کرنا جو ہے یہ تو خود اس کے اختیار اور اقتدار کی بات کہہ سکتا ہے کہ اتنی قدرت رکھتے ہوئے بھی ہم نہیں کرتے۔ صاحبِ اقتدار ہے نا۔ میں نے پچھلی دفعہ بھی عرض کیا تھا کہ اس کو تو اس نے خود ایسے حسین انداز میں بات بیان کی ہے بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (6:101) یہاں سے بات شروع کی ہے نا کہ ہم اس پوری کارگۂ کائنات کو عدم سے وجود میں لائے۔ بہت بڑی قدرت ہے یہ' بہت بڑا اقتدار ہے۔ اور اس کے آگے یہ ہے لیکن یہ سوچو کہ ہمارے بیٹا کیسے ہوسکتا ہے جب کہ میری بیوی نہیں ہے۔ یہ ہے خدا نے جو گویا خود قرآن میں یہ کہا کہ ایک طرف اس کے قادرِ مطلق ہونے کا یہ عالم کہ اتنی

عظیم کائنات کو بغیر کسی قانون کے بغیر کسی پہلے مسالے کے وجود میں لے آیا۔ اس کے بعد بیٹا ہو جانا جو ہے یہ کونسی چیز ایسی تھی جو ممکن نہ ہو اس کے لیے؟ وہ کہتا ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ خدا کی بیوی نہیں ہے۔ تو اس نے یہ پھر بتا دیا کہ اس کے بعد ہم نے یہ قانون بنایا ہے کہ انسان کی پیدائش اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ ایک مرد ہو ایک عورت ہو۔ ان میں سے اگر ایک بھی نہیں ہے خدا کر سکتا ہے لیکن اس نے کہا ہے کہ ہم نہیں کرتے۔ خود دلیل دی ہے اس نے اس بات کی کہ بیوی کے بغیر عورت کے بغیر بچہ نہیں پیدا ہو سکتا۔ تو میں نے کہا ہے CONVERSLY مرد کے بغیر بچہ نہیں پیدا ہو سکتا۔ یہ خدا کا قانون ہے اور اس قانون کو وہ توڑتا نہیں ہے وہ خود کہتا ہے کہ کیسے ہو سکتا ہے جب کہ اس کی بیوی نہیں ہے۔ تو دلیل تو یہ خدا کی دی ہوئی ہے اس دلیل کی رو سے اگر یہ مان لیا جائے کہ باپ کے بغیر نہیں ہو سکتا تو خدا کے قادرِ مطلق ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ جب اس نے خود یہ دلیل دے دی ہے لہٰذا اسے اس طرح سے نہ لیجیے کہ اگر کسی نے اسے یوں مان لیا اور وہ کہے کہ قرآن کی رو سے ایسا مجھے نظر آتا ہے تو اس کے خلاف کفر کے فتوے لگ گئے کہ صاحب! دیکھیے یہ شخص اس چیز کو بھی مانتا۔ عزیزانِ من! یہ چیزیں اجزائے ایمان نہیں ہیں۔

قرآنِ حکیم کی طرف سے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق پائے جانے والے عقائد کی تردیدی وضاحت نیز آدمؑ کی پیدائش کا معاملہ

اور اس تمہید کے بعد میں ادھر آتا ہوں کہ قرآنِ کریم ان الزامات کی تردید کے بعد اب عیسائیوں کی طرف وہ آیا ہے اور ان سے کہا ہے کہ تم حضرتِ عیسیٰؑ کے متعلق یہ عقائد رکھتے ہو۔۔ بن باپ کے پیدا ہوئے پھر اس کے بعد ان کو ابن اللہ بنایا۔ یہ نہیں ہے تو کیا صورت ہے حضرتِ عیسیٰؑ کی؟ اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ (3:59) بات ایسی صاف کی۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ پہلے سے ایک عقیدہ قائم کیا ہوا ہے ہم نے' وہ عقیدہ اپنے مقام پہ رہے قرآن کو اس کے مطابق لے آیا جائے۔ عیسیٰؑ کی مثال نزدیک (یہ عام جو ترجمہ ہے) آدم کی مثال ہے۔ پہلے تو آدم کے متعلق ہمارے ہاں عقیدہ وہ آیا جو تورات نے دے رکھا ہوا ہے۔ آدم پہلا ایک فرد تھا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ آج یہ بات تو آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے کہ انسان کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہے؟ یہ روزمرہ کی بات ہے ہر شخص جانتا ہے۔ لیکن یہ بات کہ صاحب! پہلا انسانی بچہ کیسے وجود میں آ گیا؟ یہ بڑا مشکل مسئلہ ہے۔ مرد اور عورت کے وجود کے بعد آگے پھر چل پڑنا سلسلے کا یہ بات تو آسان ہو جاتی ہے۔ یہ ابتدا کیسے ہوئی یہ تھا نا مشکل مسئلہ۔ اس مسئلے کا حل اسی صورت میں ہو سکتا تھا کہ پہلے کسی طرح سے ایک مرد کو یا ایک انسان کو یا ایک فرد کو کسی طرح سے وجود میں لے آئیں اس کو بنا ڈالیں کسی طرح۔ بن جانے کے بعد پھر مسئلہ آسان ہو جاتا تھا نا۔ اسے بنایا۔ مٹی لی اس مٹی کا ایک پتلا بنایا پھر اس مٹی کے پتلے کے اندر روح پھونکی پھر وہ مرد بن گیا۔ اب مرد تو ایک بنا لیا مشکل پھر پیش آئی آگے کہ اب اس کے بعد عورت کی ضرورت تو اس کے لیے پھر ایک مٹی کا پتلا نہیں بنایا۔ ''پتہ نئیں مٹی مک گئی خورے''

۔پھر اسی پتلے کی پسلی کو چیرا اس کے اندر سے وہ ایک بچہ نکالا ''اوخیر نال کا کی سی'' کام بن گیا۔وہ بھی اگر لڑکا ہوتا تو پھر وہ مشکل کی مشکل ہی رہتی۔عزیزانِ من! تورات کے بیانات ہیں۔ذہنِ انسانی اس سے آگے سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔اور ذہنِ انسانی نے یہی سوچا۔تورات کے انسانی ذہن نے یہ سوچا ادھر آئے تو شیو جی اور پاروتی ہمارے سامنے آئے بالکل اسی طرح سے۔یعنی پہلا انسان کسی طرح سے وجود میں لایا جائے تو آگے بات چلے نا۔ورنہ یہ مسئلہ سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ مرغی پہلے تھی یا انڈہ پہلے تھا۔

چوں نہ بینند حقیقت رہِ افسانہ زنند

ذہنِ انسانی بتدریج ارتقائی سفر کی پیداوار ہے:

ہم الزام نہیں دیتے ذہنِ انسان یہی سوچ سکتا تھا۔ہماری یہ کوئی بڑی کاری گری نہیں ہے کہ ہم نے صحیح بات سمجھ لیا۔اس پانچ چھ ہزار سال کے عرصے میں انسانی علم نے ٹھوکریں کھاتے ہوئے رسیاں تڑواتے ہوئے کتنی کاوشیں کرتے ہوئے کتنی تحقیقات کے بعد ایک مقام پہ پہنچے ہیں جس مقام پہ یہ مسئلہ بھی حل ہوتا ہے۔ہم اس لیے ADVANTAGES POSITION میں ہیں کہ جب انسانی تحقیق ایک حقیقت تک پہنچتی ہے تو وہ حقیقت وہ ہوتی ہے جو چودہ سو سال پہلے قرآن نے بیان کی ہوئی ہوتی ہے۔انسانی تخلیق کا مسئلہ آپ کی EVOLUTION کی تھیوری نے حل کر دیا صاحب۔نظریۂ ارتقا کی رو سے دو اور دو چار کی طرح بات سامنے آ گئی۔زندگی کی ابتدا غیر جاندار مادہ INORGANIC MATTER جو ہے وہاں سے شروع ہوتی ہے۔قرآن نے کہا كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنۡ تُرَابٍ (3:59) موضوع آج کا نہیں ہے کہ میں قرآن کی رو سے پورے سلسلۂ ارتقاء کی کڑیاں آپ کے سامنے پیش کروں۔آگے آتا ہے ایک مقام وہاں پہنچ کے میں یہ عرض کروں گا اور اس سے پہلے جہاں سورۃ بقرۃ میں یہ داستانِ آدم و ابلیس آئی تھی وہاں بھی میں نے اس کو بیان کیا تھا۔آج اشارتاً بیان کر کے آگے بڑھ جاتا ہوں کہ یہ ارتقا یا EVOLUTION کی تھیوری کے مطابق زندگی کی ابتدا INORGANIC MATTER سے ہوتی ہے جسے قرآن نے تراب کہا ہے۔اور اس کے بعد یہ کہا ہے کہ وَجَعَلۡنَا مِنَ الۡمَآءِ كُلَّ شَىۡءٍ حَىٍّ (21:30) پھر اس کے ساتھ جب پانی کا چھینٹا دیا جاتا ہے تو اس میں سے زندگی کی نمود ہو جاتی ہے۔اسے وہ طینِ لازب کہتا ہے چپکنے والی مٹی۔یہی ہے وہ چپکنے والی مٹی یہ جوہڑوں کے کنارے یا سمندروں کے کنارے پہ جب سورج کی تمازت اس پہ پڑتی ہے تو وہ سوکھتی ہے۔اور اس طرح سے سمندر کے اندر جو CELLS ہوتے ہیں وہ مٹی کے اندر مل کے ذرا سی ان میں حرارت جب ہوتی ہے تو اس کے اندر سے زندگی کے پہلے جرثومے پیدا ہوتے ہیں۔وہ جرثومہ جو ہوتا ہے اس کے اندر ابھی نر اور مادے کی تمیز نہیں ہوتی وہ ایک ہی ہوتا ہے اسی کو قرآن نے نفسِ واحدہ کہا ہے۔پھر وہ جرثومہ ذرا آگے بڑھ کے اگلی منزل میں وہ جوشِ نمود سے (یہ لفظ شاعری کا ہے) وہ خود پھٹتا ہے دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔اس میں سے ایک حصہ جو ہے وہ نر کا ہوتا ہے دوسرا حصہ جو ہے وہ مؤنث کا ہوتا ہے اسے DAUGHTER CELL کہتے

ہیں یا SISTER CELL کہتے ہیں۔ UNILATERAL سے اب یہ دو میں ہو جاتا ہے۔ قرآن نے جو کہا تھا کہ زندگی کی ابتدا نفسِ واحدہ سے ہوئی اور وہی نفسِ واحدہ جو ہے اس کے بعد اس میں سے نر اور مادہ پیدا ہوئے۔ لیجیے پہلا مسئلہ حل ہو گیا آپ کا۔ اس کے بعد میں نے عرض کیا ہے کہ یہ کہ مختلف کڑیاں سلسلے کی طے کرتے ہوئے زندگی پھر اس کے بعد قرآن بتاتا ہے رینگنے والے پیدا ہوئے' پانی میں تیرنے والے پیدا ہوئے' اڑنے والے پیدا ہوئے' دودھ دینے والے پیدا ہوئے اور اس کے بعد آگے بڑھ کے پھر بشریت کے پیکر کے اندر زندگی آ گئی۔ اور یہاں آنے کے بعد پچھلی کڑیوں سے ایک فرق پڑا اور وہ یہ کہ اسے صاحبِ اختیار اور ارادہ بنایا گیا اس کے اندر ایک ایسی توانائی عطا کر دی کہ جو خدا کی شان کی توانائی تھی۔ خدا خود نہیں تھا اس کے عالمِ امر کی ایک شے تھی جو انسان کے اندر داخل کر دی گئی۔ وہ شے کہ جسے ہم انسان کی ذات یا نفس یا PERSONALITY یا قوتِ ارادی کہتے ہیں۔۔ یہ دوسری بات ہو گئی۔ قرآن نے یہ بتایا تھا سلسلۂ ارتقا اس کے لیے اس کو پہلے مٹی کا ایک پتلا بنانے کی ضرورت نہیں تھی یہ تورات کا بیان تھا یہ قرآن کا بیان ہے۔ اور میں نے جیسا عرض کیا ہے میں لکھ چکا ہوں اپنی کتابوں کے اندر اس پوری تفصیل سے قرآن کی ساری کڑیاں ایک ایک دے کے۔ اور آج تک جہاں یہ EVOLUTION کی تھیوری SCIENTIFIC BASIS پہ جس مقام پہ پہنچی ہے اس کی ہر سٹیج کے مطابق قرآن کی آیت میں نے دی ہے اس میں۔ یوں آ رہی ہے کڑی بہ کڑی قرآن کی آیت اسی طریق سے جس طریق سے آج یہ آپ کی EVOLUTION کی تھیوری کی کڑیاں آتی ہیں اوپر سے۔ یہ جو یہاں آدم قرآنِ کریم نے کہا ہے یہ وہی لفظ ہے جسے اپنے ہاں ہم آدمی کہتے ہیں۔ قرآن میں آدمی نہیں آیا اس کی جگہ لفظ ہی آدم ہے اس کے معنی آدمی ہیں۔ آدمی کی تخلیق۔ اب یہ جو چیز آپ کے سامنے آ جائے تو بات واضح ہو گئی۔ عیسیٰؑ: قرآن نے کہا ہے کہ تم خوامخوہ کے لیے اس کو ایک EXCEPTION میں لیے جا رہے ہو خارقِ عادت میں لیے جا رہے ہو اس کی مثال تو ایک عام آدمی کی مثال ہے۔ اور آدمی کی تخلیق جو ہے اس کی ابتدا شروع سے یہ کر دی یعنی پہلی کڑی اس کی گنا دی خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ (3:59) اس کی تو تخلیق کا آغاز مٹی سے ہوا INORGANIC MATTER سے ہوا۔ اب یہ چیز کہ یہاں آدم کا لفظ ہے اور میں نے کہا ہے کہ یہ انسان کے متعلق ہے یہ چیز کیا قیاس پہ مبنی ہے ہمارے؟ قیاس پہ مبنی نہیں ہے قرآن پہ مبنی ہے۔ عزیزانِ من! قرآن اپنے کسی بیان کو واضح کیے بغیر نہیں چھوڑتا۔ لیکن اس کے سمجھنے کا ایک طریقہ ہے اور وہ جیسا کہ میں بار بار عرض کر چکا ہوں تصریفِ آیات ہے۔ ایک بات جو ایک مقام پہ آئی ہے دوسرے مقامات میں آپ دیکھیے تو اس کی وضاحت آپ کو ملے گی۔ اور کوئی آیت قرآن کی ایسی نہیں رہ جاتی جس کی وضاحت قرآن سے خود نہ ملتی ہو۔ اعجاز ہے اس کتابِ عظیم کا۔ خارج سے کہیں نہ جایے لینے کے لیے یہ چیزیں نہ اپنے ذہن سے تراشیے۔ محنت کیجیے کوشش کیجیے اس کے اندر جایے قرآن کے آپ کو ملے گی وہ چیز اس قرآن کے اندر۔ لیکن اس کے لیے پہلی چیز یہ ہے لا الٰہ ذہن کو آپ پاک اور صاف کیجیے ان تمام نظریات' خیالات' اعتقادات سے کہ جو پہلے مروج چلے آ رہے ہیں۔ اور وہ بڑے انسان کی تحت الشعور میں پہنچے ہوئے ہوتے ہیں ان کا نکالنا بڑا

مشکل ہے۔ کعبے کے اندر کے بت رسول اللہ ﷺ نے بھی اپنی نبوت کے آخری دنوں میں جا کے نکالے تھے یہ بڑے سخت ہوتے ہیں لمبا عرصہ لگتا ہے۔ لیکن جب تک یہ کعبے کے اندر سے نکلے نہیں تھے حضور ﷺ اس میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ یہ مکان پہلے خالی ہونا چاہیے پھر بستا ہے' لا الہ کے بعد الا اللہ آتا ہے۔

معتقدات کی گرفت بڑی سخت گیر ہوتی ہے قصۂ آدم

کسی فردِ واحد کا قصہ نہیں بلکہ نوعِ انسانی کو خطاب ہے:

عزیزانِ من! قرآن کے سمجھنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان تمام چیزوں کو نکالیے پہلے۔ اور معتقدات تو انسان کی عزیز ترین متاع ہوتے ہیں ان کا نکالنا آسان نہیں ہوتا چیخ اٹھتا ہے آدمی۔ قرآن نے اس کی وضاحت کی ہے کہ یہ کسی آدم نامی فرد کی بات نہیں ہے کہ اس کو خدا نے مٹی سے پیدا کیا۔ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ (22:5) دیکھیے خطاب ہوتا ہے تمام انسانوں سے۔ اے نوعِ انسانی! اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ (22:5) اگر تم دوبارہ اٹھائے جانے کے بعد کسی شک وشبہ میں ہو۔ پھر سن رکھیے انسانوں سے خطاب ہو رہا ہے یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ کہہ کے خطاب ہو رہا ہے۔ اگر تمہیں یہ ہو تو فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ (22:5) تو تم اس پہ غور نہیں کرتے کہ ہم نے تو تمہیں ابتدا میں تراب سے پیدا کیا تھا تمہارا آغاز وہاں سے ہوا تھا۔ تو جو خدا یہ کر سکتا ہے کہ وہ بے جان مادہ جس میں زندگی کی نمود تک نہیں اس میں سے اس قسم کا انسان پیدا کر دے اس کے لیے یہ مشکل ہے کہ اس انسان کو موت کے بعد زندہ کر دے۔ میں کہہ یہ رہا تھا یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ پوری نوعِ انسانی کے متعلق ہے۔ لہٰذا جہاں کہا ہے کہ آدم کو خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ (3:59) آدمی کے متعلق ہے انسان کے متعلق ہے۔ پھر آگے کیسے چلا سلسلہ؟ یہاں موجود ہے مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ (22:5) آپ دیکھتے ہیں کڑیاں کیسے گنا رہا ہے قرآن تراب سے پیدا کرنے کی؟ نطفے کی حالت کے اندر آئے' پھر ایک نطفہ کی صورت پیدا ہوئی اس کے اندر' متشکل غیرِ متشکل لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ (22:5) پھر اس نے گردشیں دیں مختلف گردشیں دیتے ہوئے وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى (22:5) پھر تمہارا مستقر جو تھا ٹھہرنے کا مقام رحمِ مادر تھا ایک وقتِ مقررہ کے لیے ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا (22:5) پھر بچے کی صورت میں تم باہر آ گئے ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ (22:5) یہ آگے پھر جوان ہوئے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ تراب سے سلسلہ شروع کر کے کہاں لا رہا ہے؟ یہ ہے تخلیقِ آدم' یہ ہیں آدمی کی پیدائش کے سلسلے۔ تو جہاں وہ کہتا ہے کہ آدم کے متعلق خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ تو یہ نہیں ہے کہ وہ الگ کوئی ایک فرد ہے جس کو مٹی کا پتلا بنایا گیا ہے۔ وہ تو سارا قرآن کہتا ہے الناس سے کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا خَلَقْنٰكُمْ پاور اس کے بعد یہ ساری کڑیاں گنا رہا ہے جن کی رو سے ایک بچہ پیدا ہوتا ہے۔ کہاں لکھا ہے کہ یہاں جو آدم ہم نے کہا ہے وہ ان کڑیوں میں سے نہیں گذرا؟ سارے قرآن میں کہیں نہیں۔ میں نے عرض کیا ہے نا کہ یہی لفظ جو ہمارے ہاں آدمی ہے یہی ہے عربی زبان

میں جسے آدم کہتے ہیں۔ یہاں الناس کہا ہے قرآن نے' ذرا اور آگے چلیے بے شمار مقامات میں یہ چیز ہے کہ دو چار نہیں میں تو اختصار کی غرض سے دو چار آیات مثال کے طور پہ پیش کیا کرتا ہوں ورنہ اگر آپ دیکھیں گے تو آپ کو بے شمار مقامات میں یہ بات ملے گی۔ پورے انسانوں سے خطاب ہے وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ (30:20) دیکھیے یہاں بشر کہا ہے۔ اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے اس کے قوانین میں سے یہ بھی ایک چیز ہے تمہیں اس نے تراب سے پیدا کیا اور پھر تم ایک بشر ہو کہ جو چلتے پھرتے ہو۔ تو وہاں الناس کہا ہے یہاں بشر کہا ہے وہاں آدم کہا ہے تو ظاہر ہے کہ تینوں ایک ہی چیز ہیں۔ اور اس کے بعد جو کہا کہ تم اس کو مان رہے ہو عیسیٰؑ کو کہیں یہ صورت کہ وہ اس طریق سے نہیں پیدا ہوا تم کہہ رہے ہو کہیں خدا کا بیٹا ہے؟ او بابا! اس کی مثال تو عام آدمی کی مثال ہے کہ جس کی تخلیق کا سلسلہ یہ تھا۔ یہاں صرف ایک لفظ سے ابتدا سے بات کی ہے یہاں بھی جو (30:20) آیت میں نے دی ہے اس میں صرف مِّنْ تُرَابٍ (30:20) کہا ہے اگلی کڑیاں نہیں گنائیں اگلی کڑیاں دوسرے مقامات میں گنائی ہیں۔

خدا کی ذات تو اپنی ہر اسکیم کا آغاز عالمِ امر میں لفظ کُنْ فَیَکُوْنُ سے کرتی ہے:

ان کڑیوں کے متعلق یہ چیز کہی کہ عالمِ امر کے اندر ہمارا یہ ایک قانون تھا اور قانون ہمارا یہ ہوا کرتا ہے ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ اب ہمارے ہاں كُنْ فَيَكُوْنُ بھی جو ہے اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ ساری کائنات یہ سلسلۂ تخلیق كُنْ فَيَكُوْنُ ہے صاحب! اللہ نے کہا بس اللہ نے کہا كُنْ اور وہ ہو گیا۔ حالانکہ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ یہ اسکیم ہوتی ہے وہ اسکیم ہے کہ جس میں كُنْ کے معنی ہیں اس کے عالمِ امر کے اندر اس کا ایک ارادہ اس کا فیصلہ اس کی مشیت جہاں وہ یہ کہتا ہے کہ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ وہاں ہم کسی سے پوچھتے نہیں ہیں کہ کیسے بنائیں؟ ہم خود فیصلہ کرتے ہیں کہ اس اسکیم کو کیسے چلانا چاہیے۔ اسکیم یہ جو ہوتی ہے خدا کی عالمِ امر سے متعلق وہ ہوتی ہے كُنْ اور آگے جو آپ دیکھتے ہیں فَيَكُوْنُ کیا بات ہے قرآن کی؟ اربابِ غور اس کو APPRECIATE کریں گے فَيَكُوْنُ کے اندر مضارع کا صیغہ ہے ماضی کا نہیں ہے کہ ہم نے کہا وہ ہو گیا آہاہاہا! فَيَكُوْنُ پھر وہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ آہاہاہا۔ یہ کوئی PAST ماضی کی بات نہیں ہے۔ وہ تو عالمِ امر کی بات تھی ابتدا کی وہ تو ہے كُنْ کی صورت میں ہم کہتے ہیں ہو جا وہ اس کڑی سے پہلی کڑی کی بات ہے۔ اور یہ بھی نہیں ہے کہ وہ ایک دفعہ کہیں اس نے كُنْ کہہ دیا ہے اور بس اس کے بعد پھر یہ سلسلہ جو ہے ہو گیا۔ یہ ایک پروسیس ہے یہ ایک طریق ہے یہ ایک عملِ جاریہ ہے اس میں استمرار ہے دوام ہے ہمیشگی ہے ایسے ہوتا ہے۔ جو اسکیم بھی ہمارے سامنے آتی ہے اس کے لیے ایک فیصلہ ہمارا ہوتا ہے پہلے علمِ خداوندی کا اسے اس نے كُنْ سے کہا کہ مشہود ہو جا۔ اے ہمارے فیصلے تو مشہود ہو جا۔ اور پھر اس کے بعد وہ ہوتا چلا جاتا ہے اور ایسا ہم کرتے چلے جاتے ہیں۔

تخلیق کے سلسلہ میں خدا کے ہاں ارتقائی مراحل کا ایک ایک

دن ہمارے ہزار ہزار سال' پچاس پچاس ہزار سال کے برابر ہوتا ہے:

یہ تخلیق کا امر جاری ہے۔ یَزِیۡدُ فِی الۡخَلۡقِ مَا یَشَآءُ (35:1) وہ کہتا ہے یہی نہیں ہے کہ ایک دفعہ ہم نے یہ کر دیا ہے وہ بن بنا کے پورے کا پورا COMPLETE FORM کے اندر ساری UNIVERSE آ گئی قطعاً نہیں۔ ہم اپنی تخلیق میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ اضافے بھی یہ کیسے ہوتے ہیں؟ یہی کُنۡ فَیَکُوۡنُ کے۔ اس نقشے کے مطابق ہماری اسکیم کے مطابق جس شے کو بھی وجود میں آنا ہوتا ہے پھر اس کے متعلق پہلے ایک نقشہ بنتا ہے علمِ الٰہی میں اس کی ایک اسکیم ہوتی ہے۔ اور اسکیم کے متعلق تو قرآنِ کریم نے یہ کہہ دیا ہے کہ اس کی ابتدا ہم اس کے پست ترین سطح سے کرتے ہیں۔ یُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الۡاَرۡضِ (32:5) وہاں سے ہم تدبیر کرتے ہیں اور پھر ارض سے اس کی ابتدا کرتے ہیں۔ ثُمَّ یَعۡرُجُ اِلَیۡہِ فِیۡ یَوۡمٍ کَانَ مِقۡدَارُہٗۤ اَلۡفَ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ (32:5) پھر وہ آہستہ آہستہ اپنی انتہا تک چڑھتا چلا جاتا ہے چڑھتا چلا جاتا ہے ایک ایک دور میں جس کا طول تمہارے حساب وشمار سے ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔ کئی جگہ لکھا ہے پچاس پچاس ہزار سال ہوتا ہے۔ دیکھتے ہیں مِنَ السَّمَآءِ امر ہے کُنۡ اس کی ابتدا ہوتی ہے پست ترین درجے سے پھر وہ اس کے بعد اپنے ارتقائی منازل طے کرتا ہوا اوپر چڑھتا چلا جاتا ہے۔ ایک ایک دور پچاس پچاس ہزار سال کا بھی ہوتا ہے یوں جا کے وہ فَیَکُوۡنُ ہوتا ہے جسے ہم نے کہا ہے کُنۡ فَیَکُوۡنُ۔ عجیب چیز ہے قرآن۔ کیوں نہ ہو؟ یہ اس خدا کا ہے کہ جس نے یہ سارا سلسلہ اس طرح سے جاری کیا۔

سائنس ایجاد تک پہنچ ہی نہیں سکتی' وہ صرف رموز کو Discover کرتی ہے:

سائنس کسی چیز کو ایجاد نہیں کرتی وہ ان چیزوں کو DISCOVER کرتی ہے اس کے اوپر جو جہالت کا پردہ پڑا ہوا ہوتا ہے اس پردے کو صرف اٹھاتی ہے۔ ہم کتابِ کائنات کو لکھتے نہیں ہیں ہم کتابِ کائنات کو صرف پڑھتے ہیں لکھی ہوئی تو یہ خدا کی ہے۔ اس لیے جو یوں پھیلی ہوئی ہے یہ اس طرح سے لکھا ہوا ہے دونوں ہی خدا کی ہیں۔ کوئی وہاں مشاہدہ کرتا ہے کوئی یہاں اس کو آ کے دیکھ لیتا ہے۔ عزیزانِ من! دونوں میں اختلاف تو ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ہے وہ چیز کہ آدم کی مثال عام آدمی کی مثال ہے یوں اس کے سلسلۂ تخلیق کا آغاز ہوا اور اس طرح سے وہ مختلف مراحل طے کرتا ہوا پیکرِ بشریت کے اندر آیا۔ کہیں الناس کہا ہے کہیں بشر کہا ہے کہیں آدم کہا ہے۔ اسی پروسیس کے مطابق' کوئی EXCEPTION نہیں اس کے اندر حضرتِ عیسیٰؑ کے متعلق۔ کہتے ہیں کہ صاحب! دیکھیے نا کہا ہے کہ مثال اس کی آدم کی ہے۔ اور آدم وہ تصور ہوا۔ میں کہتا ہوں علاوہ اور باتوں کے اس پہ تو اعتراض اتنا بڑا پڑتا ہے کہ اگر آدم کی مثال ہے عیسیٰؑ کی تو آدم کے متعلق تو آپ کا عقیدہ یہ ہے کہ انؑ کا نہ باپ تھا نہ ماں تھی یہی ہے نا عام عقیدے کے مطابق۔ جس کو آپ مٹی کا پتلا بناتے ہیں ان کا تو نہ باپ تھا نہ ماں تھی آدم

کی۔ تو جب اس کی باپ اور ماں دونوں نہیں تھے اور یہاں اس کی ماں کے متعلق تو آپ مانتے ہیں کہ وہ اس کو تو بار بار لکھتا ہے ابنِ مریم تو یہ تو مثال ہی ناقص ہوگئی۔ خدا کی طرف یہ منسوب کر رہے ہیں کہ وہ ایک مثال پیش کرتا ہے اور مثال اتنی ناقص ہے کہ جس کی مثال پیش کرتا ہے وہ تو پیدا ہوا تھا بن ماں اور باپ دونوں کے اور جس کو پیش کرتے ہیں آپ وہ وہ ہے کہ جس کی ماں کا آپ خود اقرار کرتے ہیں کہ وہ تھی مثال ہی ناقص ہے۔ می نہ سزد خدائے را۔

قرآنِ حکیم کو مَس کرنے سے پہلے ذہنوں کے بُت خانوں سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا:

بات ہی غلط ہو جاتی ہے اگر اس کو یوں لیں آپ تو۔ اس نے تو بات صاف کی تھی لیکن وہ جو پہلے اعتقادات ذہنوں کے اندر ہمارے آئے ہوئے ہیں وہ نہیں اس چیز کو اندر جانے دیتے کہ لا الہ جب تک نہ ہوگا الا اللہ آ ہی نہیں سکتا۔ سمجھ میں آ سکتی ہیں یہ باتیں بشرطیکہ ذہن پہلے ان چیزوں سے خارج کیا جائے۔ وہ جو اس نے کہا تھا لَّا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ۝ (56:79) جس کا ترجمہ ہم نے اپنے ذہن کی سطح کے مطابق کر لیا کہ قرآن کو چھونے کے لیے پہلے پاک صاف ہونا چاہیے اور وہ نہا کے غسل کر کے وضو کر کے وہاں تک ہم رہے۔ وہ بھی ٹھیک ہے کہ پاک صاف تو ہونا چاہیے۔ بات تو یہاں یہ نہیں کہی گئی کہا تو یہ گیا ہے کہ اس سے وہی انسان مس کر سکتا ہے اس سے کچھ حاصل کر سکتا ہے جو پہلے اپنے قلب و نگاہ کو انسانی خیالات سے پاک اور صاف کر لے۔ قرآن سمجھ میں نہیں آ سکتا اگر اس کے اندر اور بت بیٹھے ہوئے ہوں۔

بیاں میں نقطۂ توحید آ تو سکتا ہے
تیرے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے

عزیزانِ من! دماغ کو بت خانے سے پاک کرنے سے خدا کی کتاب سمجھ میں آتی ہے۔ یہ کہنے کے بعد کہا اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ (3:60) لو حقیقت آ گئی تمہارے خدا کی طرف سے' حق آ گیا تمہارے خدا کی طرف سے۔ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ (3:60) اے مخاطب! اب تو تمہیں کوئی جھگڑا نہیں کرنا چاہیے اس معاملے کے اندر۔ ہم نے تو بات صاف کر دی اب تو کوئی چیز شک و شبہ کی نہیں رہی لہٰذا جھگڑے کی کوئی بات نہیں رہی۔ نبی اکرم ﷺ سے پھر کہا گیا فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ۟ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ (3:61) جو آیت میں نے پہلے ابھی کہی تھی وہ حضرتِ عیسیٰؑ کی پیدائش کی' یہ اگلی آیت جو ہے اس کے لیے پھر ہمارے دماغ کے اندر ایک چیز پہلے سے آئی ہوئی ہے اور اس کے مفہوم کے متعلق بھی پھر عجیب عجیب پریشانیاں ہمارے ہاں آتی ہیں۔ عام طور پر اس کے متعلق جو ترجمہ کیا جاتا ہے اور سمجھا جاتا ہے اور وہ تمام تفاسیر میں آپ کو ملے گا جو پہلے لکھی گئیں۔ وہ اس لیے کہ روایات میں یہ چیز ہمارے آئی ہوئی ہے۔

ہمارے ہاں لکھی گئی تمام تفاسیر روایات پر مبنی ہیں:

ہماری تفاسیر جتنی بھی ہیں وہ روایات پر مبنی ہیں۔ روایات بھی رسول اللہ ﷺ کی وفات کے قریباً دواڑھائی سو سال بعد مدون ہوئیں زبانی، کسی تحریری میٹریل کے بغیر۔ اور ان روایات کے اوپر ہماری تفاسیر مرتب ہوئیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اگر پھر اس کے باوجود تیرے ساتھ یہ لوگ جھگڑا کریں بعد اس کے کہ تیرے پاس العلم آ چکا ہے۔ العلم: قیاس آرائی نہیں، الحق، العلم خدا کی طرف سے جو علم ملتا ہے وہ آ چکا ہے۔ تو اس کے باوجود اگر یہ لوگ تجھ سے جھگڑا کرتے رہے باز نہیں آتے اس کے بعد بھی۔ میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ عام طور پہ جو اس کا معنی سمجھا جاتا ہے پہلے لے آیے۔ تو پھر ان سے تم کہو کہ آؤ! ہم بھی اپنے آدمیوں کو اپنی عورتوں کو بلا لیتے ہیں خود بھی ساتھ شامل ہو جاتے ہیں تم بھی اس طرح سے اپنے ہاں ان چیزوں کو بلا لو۔ بات کیا ہوئی؟ میں آگے پھر بیان کروں گا کہ کیا سمجھا جاتا ہے۔ روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس نجران کے قبیلے کے عیسائی آئے آپ ﷺ نے ان کو اپنی مسجد میں ٹھہرایا۔ اس کے بعد ان کے ساتھ اسی پیدائشِ حضرت عیسیٰؑ کے متعلق باتیں ہوئیں۔ جو کچھ آپ ﷺ نے ان سے یہ کہا وہ مطمئن نہ ہوئے۔ پہلے تو یہی سوچیے کہ اگر آپ ﷺ نے ان سے یہی کہا ہوتا کہ بھئی! ہم بھی یہی مانتے ہیں کہ وہ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے تو جھگڑا کاہے کا رہتا پھر۔ یعنی یہ تو ان کا جو دعویٰ تھا اس کو پہلے ہی مان چکے۔

قرآنِ حکیم کی واضح تعلیم کے بعد روایات کے مطابق نبی اکرم ﷺ کا دوسروں سے مباہلہ کسی صورت بھی حقائق پر مبنی نہیں ہوسکتا:

قرآن کہتا ہے اس کے باوجود یہ نہیں مانتے جھگڑتے چلے جاتے ہیں باز ہی نہیں آتے بات صاف ان سے ہم نے کہہ دی ہے پھر بھی جھگڑ رہے ہیں۔ تو اختلاف تھا نا بنیادی ان دونوں میں۔ کیا بات ہے قرآن کی؟ کہ جی وہ پھر بھی جھگڑتے رہے تو پھر کیا ہوا؟ تو آپ ﷺ نے ان سے کہا کہ بھئی! بات یوں صاف نہیں ہوتی آؤ اب آخری حربہ ہے تم اپنے کنبے والوں کو لے آؤ میں اپنے کنبے والوں کو لے آتا ہوں نَبْتَهِلْ اس کے معنی مباہلہ کرلو جی۔ آیا نا ذہن شریف میں آپ کے کہ بات کہاں پہنچ رہی ہے؟ پھر کیا کرو؟ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ (3:61) اُدھر بیٹھ جاؤ ان کو لے اِدھر میں بیٹھ جاتا ہوں ایک دوسرے پہ لعنتیں بھیجتے ہیں ''جیہڑا بہتیاں لعناں بھیجے جت گیا''۔ اللہ اکبر۔ چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی ﷺ ایست۔ ایک پیغمبر کا یہ مقام ہے؟ جو یہ کہتا ہے کہ میں اپنے ہر دعوے کو دلیل سے پیش کرتا ہوں هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (2:111) سچائی کی دلیل یہ ہے کہ دلیل پیش کرو۔ وہ اس مقام پہ آ جائے گا پھر؟ اور پھر اپنے آپ کو لو اپنے بال بچوں کو ساتھ لو تم بھی لو میں بھی لیتا ہوں تو ہم بیٹھ جاتے ہیں ایک دوسرے کے سامنے فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ (3:61) اور اس کے بعد کہتے ہیں خدا جھوٹے کے اوپر لعنت برسائے تم بھی کہو میں بھی کہتا ہوں۔ یا اللہ یا اللہ۔ اور اس کے

بعد یہ ہے کہ صاحب! وہ اس سے ڈر گئے اور انہوں نے کہا کہ صاحب وہ تو جھوٹے پہ لعنت برساتا ہے ہمیں یہ نہیں قبول کرنا چاہیے چیلنج۔ یعنی انہوں نے سچا اس کو تسلیم کرلیا نا اور وہ میدان چھوڑ کے بھاگ گئے۔ اور کہتے ہیں یہ اس طرح سے محمد رسول اللہ ﷺ کے دعوے کی صداقت کا ثبوت مل گیا انہیں۔ وہ عیسائی کے عیسائی رہے اس کے باوجود وہ ایمان نہیں لائے ''تیلی وی کیتا روکھاوی کھادا''۔

لفظ مباہلہ یا ملاعنہ کا مروجہ مفہوم اور اس کے استعمال کی صورت:

عزیزانِ من! سوچیے کہاں ہم پہنچے ہوئے ہیں؟ بھری ہوئی ہیں ہماری کتبِ احادیث ان روایات سے' تفسیر ہو رہی ہے اس کی بنا پر۔ کوئی نہیں سوچتا کہ ہم رسول ﷺ کو کس مقام پہ لا رہے ہیں؟ عزیزانِ من! تصور میں لایئے اس نقشے کو کہ رسول اپنے بال بچوں کو لے کے بیٹھا ہوا ہے سامنے ان کو بٹھایا ہوا ہے وہ لعنتیں بھیج رہے ہیں ایک دوسرے کے اوپر۔ وہ کہتے ہیں اس طرح سے بات جو ہے صداقت ثابت ہوجاتی ہے صداقت کے ثبوت کا یہ طریق ہے۔ پہلے دور کا تو ہمیں پتا نہیں ہمارے دور میں یہ جو ٹرم تھی مباہلہ' مباہلہ بھی اس کو کہتے ہیں ملاعنہ بھی اس کو کہتے ہیں۔ مباہلہ کے معنی ایک دوسرے سے مباہلہ کرنا لے لیا اس کا نام مباہلہ رکھا ایک نئی ٹرم انہوں نے قائم کی پھر اس کو ملاعنہ کہا ایک دوسرے پہ لعنتیں برسانا۔ اور ہمارے دور میں اس کا بڑا چرچا ہوا مرزا قادیانی نے اس چیز کو بات پیش کی۔ جہاں کہیں دلیل نہ ملی جہاں کہیں اس سے عاجز آئے اس کے بعد کہا مباہلہ کرلو۔ روز آپ سنتے ہوں گے ان حضرات سے کہ مباہلہ کرلو۔ بھئی! کیا کرلو؟ پھر وہ جوان کا مشہور ہے مباہلہ کہ سچے کی زندگی میں جھوٹا مرجائے لعنت بھیجو کرو انتظار۔ وہ مشہور ہے وہ چیز۔ عزیزانِ من! مجھے فرقہ وارانہ بحثوں میں الجھنے کی ضرورت نہیں ہوتی اس لیے کہ میں کسی فرقے سے متعلق ہی نہیں ہوں۔ میں ان باتوں کو بیان کرتا ہوں واقعات کی رو سے واقعات کس طرح سے یہ ہوتے ہیں؟ مشہور ہے کہ انہوں نے مولوی ثنااللہ کے ساتھ یہ مباہلہ کیا'' سچے کی زندگی میں جھوٹا مرجائے''۔ ثنااللہ جیتے رہے یہ فوت ہوگئے پڑ گئی مصیبت۔ لیکن انہوں نے کہا کہ نہیں صاحب! گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے ہمیں تفسیر بھی آتی ہے اپنا مدعا کہیے۔ اب لگی تفسیریں ہونے اس کی۔ ایک غلط اینٹ رکھی جائے بنیاد میں'' تا ثریا می رود دیوار کج''۔

مباہلہ کے سلسلہ میں پیش کی جانے والی شہادتیں اور پھر لفظ مباہلہ کا قرآنی اور لغوی مفہوم:

عزیزانِ من! یہ سوال ہی نہیں ہے۔ نہ مباہلہ اس کو کہتے ہیں نہ نبی کی شان یہ ہے کہ وہ لعنتیں بھیجے۔ اور ان کے ہاں جب ان سے کہا کہ صاحب! یہ دیکھیے مرزا صاحب نے اپنی کتابوں میں اتنی گالیاں دی ہیں اور وہ بالکل بازاری سطح کی گالیاں دی ہیں زبان زیب نہیں دیتی ان کا اعادہ کیا جائے۔ تو کہا گیا کہ یہ کیا چیز ہے؟ کہنے لگے انہوں نے دی ہیں تو کیا ہوا قرآن شریف میں دیکھو لکھا ہوا ہے کہ لعنتیں برساؤ تو لعنت تو سب سے بڑی چیز ہوتی ہے۔ مقامِ نبوت ذہن میں ہی نہیں آتا ان کے

۔اوکم بختو! نبوت تو ہے ہی نبوہ سے جس کے معنی ہی بلندی کے ہیں۔اپنے سے کچھ تو اونچا کرو اس کو۔عزیزانِ من! اب آیئے قرآن کی طرف۔نبتھل اس میں لفظ ہے جہاں سے مباہلہ ہے اس کے معنی ہیں یہ کچھ کرنا جو میں نے یہ عرض کیا۔عربی زبان میں بھل کے معنی ہوتے ہیں کسی سے قطع تعلق کر لینا' کسی کو آزاد چھوڑ دینا' کسی سے یہ کہنا کہ بھئی! اس کے بعد پھر ٹھیک ہے تم جاؤ اپنے راستے کے اوپر مجھے اپنے راستے کے اوپر جانے دو۔ان کے ہاں کہتے ہی یہ ہیں جب کسی اونٹنی کو وہ اس طرح چھوڑ دیتے ہیں کہ مہار بھی اس کی نہ ہو۔عام طور پہ وہ اس کے تھنوں کے اوپر کپڑا باندھ دیتے تھے یا وہ چھکا چڑھا دیتے تھے کہ کوئی دودھ نہ دوہے۔وہ بھی اتار دیا جائے مہار بھی اتار دی جائے اور یوں چھوڑ دیا جائے اس کو' اس کو وہ کہتے ابتھال۔ جس شخص سے کوئی تعلق نہ رکھا جائے اس کو وہ کہتے ہیں ابتھال۔ان کی زبان میں اس طرح سے یہ آج بھی USE کرتے ہیں۔بھل کے معنی ہوتے ہیں کہ چھوڑ دینا۔قرآنِ کریم نے یہ بتایا ہے کہ انہیں سمجھاؤ۔ایک مقام پہ نہیں بیسیوں مقامات میں کہ انہیں سمجھاؤ دلائل سے' براہین سے' ان کے اپنے ہاں سے اسناد پیش کر کے' علم کی بارگاہ سے۔یہ سب کچھ کرنے کے باوجود اگر یہ پھر بھی اپنی اس کج بحثی کے اوپر اڑے رہیں تو پھر خوامخواہ وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں پھر ان سے مغز مارنے کی ضرورت نہیں ہے۔جو دلیل و برہان سے بھی نہیں سمجھتا پھر اس کے بعد وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ (15:85) یہ انقلاب جس کی طرف تو دعوت دیتا ہے یہ تو آ کے رہے گا۔اب یہ چیز کہ اپنا سارا وقت ان کوڑھ مغزوں کے پیچھے ہی تو ضائع کر دے وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (25:63) جب ایسوں کے ساتھ واسطہ پڑ جائے جو نہ دلیل سنیں نہ برہان مانیں نہ سند مانیں پھر کیا کیا جائے؟ لگا رہے ان کے پیچھے؟ کہا نہیں! فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ (15:85) ان سے کنارہ کش ہو جا ان سے الگ ہو جا' آہاہاہا! الگ بھی تو حسن کارانہ انداز سے ہو۔یہ ہے مقام۔

دلیل و براہین کے میدان میں ناکام رہنے والے آخر پر اکثر استہزا پر اتر آتے ہیں:

میں نے عرض کیا ہے کہ کئی مقامات میں قرآن نے کہا ہے کہ جب یہ مقام آ جائے کسی کے ساتھ تو پھر زیادہ وقت ان کے ساتھ ضائع نہ کرو تم پھر اپنا کرو۔کہا یہاں تک جب یہ چیز ہو گئی تو وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ (73:10) پھر جب کسی کے پاس دلیل برہان نہ رہے تو اس کے بعد پھر وہ اعتراضات' الزامات حتیٰ کہ گالیوں تک اتر آتا ہے نا استہزا قرآن کہتا ہے اس پہ آ جاتے ہیں۔یہ کچھ حرکتیں کرنے لگ جاتے ہیں اس سے بڑا دل دکھتا ہے انسان کا۔ایک شخص دلیل و برہان سے بات کرے اور دوسرا شخص آپ کا منہ چڑا کے چلا جائے آپ دیکھتے ہیں کس قدر تنگی گذرتی ہے۔وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ اب ان کے پاس کوئی دلیل و برہان نہیں رہتی اب جو بکواس یہ کر رہے ہیں اس سے تنگی نہ محسوس کر دل برداشتہ نہ ہو جا استقامت سے جما رہو۔ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا (73:10) ان سے کنارہ کش ہو جا چھوڑ دے۔یہاں بھی وہ کہا ہے هَجْرًا جَمِيْلًا گالی دے کر نہیں نہایت حسن کارانہ انداز سے۔عزیزانِ من! جمیل کا لفظ آیا ہے انتہا ہے خوبصورتی کی جس میں۔رسول تو جس کو

گلے لگا تا ہے اس کو بھی جمال کی حیثیت سے لگا تا ہے اور جس کو وہ چھوڑتا ہے کہ جمال کی حیثیت سے چھوڑ۔ لعنت برسائے گا یہ رسول ﷺ ان کے اوپر؟ جس کے متعلق کہا ہے وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (21:107) اور عالمین کہا ہے اس نے تو صرف مؤمنین تو نہیں کہا ہے۔ جو عالمین کے لیے رحمت بن کے آیا ہے وہ ان لوگوں کے اوپر لعنتیں برسانا شروع کرے گا؟ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا (73:10) مقامِ نبوت ہے۔ وہ گالیاں دے رہے ہیں استہزا کر رہے ہیں تکذیب کر رہے ہیں الزامات عائد کرتے ہیں بات نہیں سنتے کچھ نہیں! کنارہ کش ہو جا حسن کارانہ انداز سے کنارہ کش ہو جا۔ چھوڑ دینا یہ وہ مقام ہے۔ آ جایے اب

قرآنِ حکیم کے ہاں الجھے ہوئے مسائل کا حل اور لفظ نَبْتَهِلْ کا لغوی مفہوم:

قرآن کے ان مقامات کے بعد آیے ادھر۔ اور ابتہال کے معنی میں نے ابھی عرض کر دیا عربی زبان کے کسی مستند لغت میں دیکھیے کہ بھل کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ کہا کہ فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ (3:61) جو اس طرح سے العلم آ جانے کے بعد بھی اس طرح سے کٹ حجتی کرتے چلے جائیں یوں ہی جھگڑا کرتے چلے جائیں کوئی بات ہی نہ سنیں بات ہی نہ مانیں اس کے بعد کیا کہو؟ کہو یہ کہ بھائی! سیدھی سی بات ہے ہم ہمارے سارے متعلقین جتنے بھی ہیں' تم تمہارے متعلقین جو تمہارے ساتھی اور ہیں مرد اور عورت جو کچھ بھی ہیں تمہارے اہلِ خاندان' تمہارا اور ہمارا اس کے بعد افتراق ہے۔ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ (18:78) تمہارا اپنا راستہ ہے میرا اپنا راستہ ہے تم اپنے ہاں اپنے گروہ کو لے لو میں اپنے گروہ کو لیتا ہوں ثُمَّ نَبْتَهِلْ (3:61) اور ایک دوسرے کو آزاد چھوڑ دو۔ کیا بات کہی ہے؟ جھگڑا کا ہے کا اس لیے؟ خوامخوہ کے لیے تم یوں لپٹے چلے جا رہے ہو نہیں بابا! میرے پاس اتنی فرصت نہیں ہے۔ کیا کیا جائے اس کے بعد؟ عزیزانِ من! عجیب مقامات ہیں قرآن کے۔ اور دیکھیے لعنت کے معنی کس طرح واضح ہوتے ہیں۔ پہلے تو یہی لیجیے نَبْتَهِلْ (3:61) آزاد چھوڑ دیجیے کوئی علاقہ نہ رکھیے ایک دوسرے کے ساتھ۔ اپنے متعلق کہا ہے نَبْتَهِلْ (3:61) آؤ ہم چھوڑ دیں ایک دوسرے کو۔ کیا صورت ہوئی؟ قُلْ (6:136) اور یہاں کہو يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ (6:136) تم کہتے ہو کہ ہمارا طریق جو ہے یہ ہے کامیابیوں' کامرانیوں کا طریق صحیح منزل پہ پہنچانے کا۔ میں کہتا ہوں کہ غلط ہے تمہارا طریق' جو پروگرام میں دے رہا ہوں اس سے انسانیت اپنی منزل پہ پہنچے گی۔ تم اس چیز کو مانتے نہیں۔ جھگڑے کی بات نہیں اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ بات یہ لفظوں کی نہیں ہے بات تو وہ ہے کہ جس کو عمل میں لانا ہے۔ اب اگر اس طرح سے دلائل و براہین سے بات نہیں مانتے تم اپنے پروگرام پہ عمل کرو مجھے آزاد چھوڑ دو کہ میں اپنے پروگرام پہ عمل کروں۔ میں تمہارے اندر INTEREFERE نہیں کروں گا مداخلت نہیں کروں گا تم میرے پروگرام میں مداخلت نہ کرو۔ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ کیا بات ہے صاحب اس رسول ﷺ کی؟ بات ختم ہو جائے گی PRAGMATIC

TEST آجائے گا نتائج بتائیں گے کہ کس کی بات سچی تھی۔ دلائل سے اگر تم CONVINCE نہیں ہوتے نتائج پھر بتائیں گے۔ عزیزانِ من! نتائج بتاتے ہیں عمل کرنے سے۔ قرآن تو ایک نظامِ زندگی ہے اس کو عمل میں لانے کے بعد اب دیکھیے یہاں کتنی بڑی ایک بات سامنے آ گئی۔

قیامت کا تصور برحق لیکن زندگی خود بھی تو گناہوں کی سزا دیتی ہے:

ہمارے ہاں تو جتنا بھی دین کا یا مذہب کا پروگرام عبادات وغیرہ ہیں نا یہاں جو کچھ آپ کرتے رہیے اس کے بعد جوتے کھاتے رہیے نتائج اس کے قیامت میں جا کے برپا ہوں گے پیدا ہوں مرتب ہوں گے۔ قیامت برحق ہے لیکن تصور یہ ہے کہ وہیں ہوں گے۔ اس لیے کہ اگر آپ اس کو کہیں لوگوں سے کہہ دیتے کہ یہاں نتائج مرتب ہوں گے تو جس حالت میں ہم گذر رہے ہیں یعنی کون آپ کے قریب آتا اور کون آ رہا ہے آپ کے قریب۔ وہ کہہ رہا ہے رسول ﷺ ان سے کہ جاؤ اپنے پروگرام پہ تم عمل کرو۔ کتنی بڑی آزادی دے رہا ہے وہ ان کو۔ کہیں اس مخالف کو نہ اینٹ مارتا ہے نہ پتھر مارتا ہے نہ گالی دیتا ہے نہ کہیں وہ گھیراؤ کرتا ہے نہ پتھراؤ کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ تم کام کرو دیکھو پھر اس کے بعد' مجھے کام کرنے دو اپنے مطابق۔ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ((6:136 فَسَوْفَ دیکھیے یہاں اورف جو ہے اس کے اندر اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کا نتیجہ نکلے گا فَسَوْفَ کے معنی ہیں بڑی جلدی۔ تَعْلَمُوْنَ پھر سمجھ جاؤ گے تم بہت جلدی۔ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ (6:136) انجامِ کار کس کا خوشگوار ہوتا ہے فوراً سمجھ میں آ جائے گی بات۔ اور وہاں تم دیکھو گے کہ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (6:136) آج میں نظری طور پہ تم سے کہتا ہوں کہ ظالم کی کھیتی پنپا نہیں کرتی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی نا کوئی بات نہیں جھگڑنے کی کوئی بات نہیں۔ تم جاؤ یہ ظلم و نا انصافی کے راستے کے اوپر چلے جاؤ کرو دھاندلیاں کرو نا انصافیاں کرو نا مساوات پیدا اس معاشرے کے اندر۔ دلیل سے سمجھا رہا ہوں نہیں بات سمجھ میں آتی۔ کرو تم اس کے مطابق' میں عدل و انصاف کے مطابق ایک معاشرہ قائم کرتا ہوں نتائج خود بتا دیں گے کہ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ انجامِ کار پھر کس کی کھیتی پنپتی ہے یہ بات ظاہر ہو جائے گی۔

لعنت کے معنی تو خوشگواریوں سے محروم ہونے کے ہیں:

کہا کہ آؤ وقت ضائع نہ کرو کٹ حجتیوں میں نہ پہنچو تم اپنے ہاں کام کرو مجھے یہاں کام کرنے دو یہ ہے ابتہال یہ ہے مباہلہ NOT INTERFERE میں بھی INTEREFERE نہیں کرتا۔ کام کرنے دو اس کے بعد کیا چیز نظر آ جائے گی؟ وہی جو وہاں کہی۔ عربی زبان میں لعنہ کے معنی ہوتا ہے خوشگواریوں سے محروم رہ جانا۔ کہا کہ یہ اس طرح سے آزاد چھوڑ دو مجھے بھی تم بھی آزاد رہو مجھے اپنی جگہ کام کرنے دو تم اپنی جگہ کام کرتے چلے جاؤ اور اس کے بعد نتائج بتا دیں گے کہ جو جھوٹا ہے وہ زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ جائے گا۔ بیٹھ کے ایک دوسرے پہ لعنتیں نہیں برسا رہے۔ وہ کہہ یہ رہا ہے

کہ نظری بحث ختم ہوگئی دلائل سے تم سمجھنا نہیں چاہتے میں نے بڑی کوشش کی کہ تم سمجھو اس چیز کو' فکری طور پر تم قائل نہیں ہونا چاہتے۔ پھر اس کے بعد کٹ حجتی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اتنا وقت کہاں زندگی کے اندر؟ میں تو زندگی کو ئی کھیل تھوڑی سمجھتا ہوں یہ تو بڑی سیریس چیز ہے اس کا تو ایک ایک لمحہ بڑا قیمتی ہے۔ ٹھیک ہے یوں سمجھ میں نہیں تمہارے بات آتی۔

فرعون کے دربار میں حضرت موسیٰؑ کا اندازِ گفتگو:

نبی مناظرے نہیں کرتا مباحثے نہیں کرتا اس کا تو مقام یہ ہوتا ہے کہ فرعون کے پاس حضرتِ موسیٰؑ آتے ہیں آ کے اپنا دعویٰ پیش کرتے ہیں دلائل پیش کرتے ہیں۔ بڑا سمجھدار تھا اس نے دیکھا کہ معاملہ بگڑ رہا ہے دلائل کی رو سے یہ غالب آ جائے گا اس نے وہ راستہ اختیار کیا جو ہر مذہب پرست راستہ اختیار کرتا ہے۔ کہا کہ موسیٰؑ! یہ بتاؤ یہ بات پھر کرلیں گے یہ بتاؤ کہ یہ اہلِ دربار بیٹھے ہوئے ہیں وزرا امرا سارے مشرکین وہ بھی ان کے باپ دادا بھی اسی طرح سے مشرک۔ کہا کہ یہ بتاؤ کہ یہ جتنے یہ بیٹھے ہوئے ہیں ان کے اسلاف کی کیا حالت ہے جنت میں ہیں یا جہنم میں ہیں؟ یعنی سیدھی سی بات تھی کہ یہ کہے گا کہ جہنم میں ہیں اور جوں ہی اس نے کہا اس نے کہا لو دیکھو کیا کہہ رہا ہے تمہارے فلاں حضرت صاحب کو اور پٹوا دیا معاملہ ختم ہوا۔ دیکھا یہ حکمتِ فرعونی۔ اسے پتہ نہیں تھا واسطہ کس سے پڑا ہوا ہے؟ اس نے کہا کہ کیا حالت ہے ان کے اسلاف کی؟ کہا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ (20:52) ان کا معاملہ میرے خدا کے حساب کتاب کے رجسٹر میں ہے تم بتاؤ بنی اسرائیل کو چھوڑتے ہو یا نہیں؟ یہ ہوتا ہے نبی A PRACTICAL MAN ' مناظروں میں نہیں الجھتا مباحثوں میں نہیں الجھتا۔ اس نے کہہ دیا ان سے کہ میں نے تمہیں سمجھانے کی کوشش کی تم نہیں سمجھتے۔ معاملہ ختم کرو' جاؤ اپنے طور طریقے پہ تم کام کرتے چلے جاؤ' مانتے چلے جاؤ کہ جو شخص مسیحؑ کے کفارے کے اوپر ایمان لائے گا اس کی نجات ہوجائے گی۔ اور اس عقیدے کے بعد جو امت تیار ہوگی جو قوم تیار ہوگی پھر اس میں اخلاقی اقدار کو ڈھونڈتے پھرنا۔ جس قوم کا عقیدہ یہ ہوجائے کہ محض کسی کفارے پہ ایمان لانے سے دین اور دنیا سب کی اس میں بخشش ہوجاتی ہے یہاں دنیا سنور جاتی ہے۔ کفاروں کے عقیدے کی بنا کے اوپر نتائج کی توقع کرنے والی قوم کا جو انجام ہوا کرتا ہے تم خود دیکھ لو گے۔ جاؤ یہ عقائد اپنے ہاں کے پھیلاتے چلے جاؤ اور اس کے بعد یہ کرو۔ اور میں یہ کہوں گا کہ صحیح فارمولے کے مطابق کام کرو اور اس کام کا نتیجہ یہاں بھی ملے گا آگے جا کے بھی ملے گا۔ میں یہ کرتا ہوں تم وہ کرتے چلے جاؤ نتائج خود بتا دیں گے کہ کون سچا تھا اس معاملے کے اندر۔ اس پریکٹیکل رسول ﷺ نے اس پیغامبرِ انقلاب ﷺ نے اس یکسر عملی انسان میں خدا کی دی ہوئی اس روشنی کے مطابق ایک نظام ایک معاشرہ قائم کیا۔ بازنطینی حکومت رومن کی امپائر اتنی عظیم الشان' ایران کی اتنی عظیم الشان تہذیب کی حامل قوم صدیوں سے جن کے نقارے بج رہے تھے چار دن کے اندر اندر ان کے پاؤں کے نیچے تھی۔ نتائج نے خود بتا دیا کون جھوٹا ہے اور کون سچا ہے؟ کہا یہ ہے اب طریقہ کام کرنے کا یہ ہے جو کچھ میں کہتا ہوں۔ اور یہ کچھ کہنے کے بعد کہا اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ

الْحَقُّ (3:62) یہ جو ہم نے بیان کی ہے بات' قصے ان کے ہاں بھی ہیں داستانیں انہوں نے بھی تراشی ہوئی ہیں لیکن جو صحیح واقع ہے جو صحیح بات ہے وہ یہ ہے جو ہم نے بیان کی ہے۔ اور یاد رکھو بات کا ملخص کیا ہے؟ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ (3:62) حضرتِ عیسیٰؑ کو بن باپ پیدا کر کے اس کو الوہیت کے مقام کے اوپر پہنچانا! ان سے کہہ دو کہ شانِ الوہیت صرف ایک خدا کے لیے سزاوار ہے کسی اور کے لیے نہیں ہے۔ یہ ہے ملخص ان تمام واقعات کا جو ہم بیان کرتے ہیں۔ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (3:62) اور وہ ہے صاحبِ اقتدار' غلبے کا مالک ہے۔ دھاندلی سے نہیں غلبہ پیدا کرتا حکمت پہ مبنی ہے RATIONALLY ہر چیز وہ کرتا ہے قانون کے مطابق کرتا ہے SCIENTIFICALLY اس کے یہ پروسیس ہوتے ہیں۔

وحی کی ہر بات حکمت پر مبنی ہوتی ہے وہاں دھاندلی نہیں ہوتی:

عزیزانِ من! حکمت میں تمام چیزیں آ جاتی ہیں۔ تمہاری عقیدت مندیاں چاہتی ہیں کوئی عجوبہ ہونا چاہیے اس کے اندر۔ فلاں بزرگ صاحب یہاں آئے وہ اس علاقے کے اندر تمام ہندو بستے تھے اور مشرک بستے تھے انہوں نے آ کے صاحب دیکھا کہ وہ روز دریا کے اوپر یہاں سے وہاں تک پیدل چل کے پار چلے جایا کرتے تھے وہاں سے واپس آ جایا کرتے تھے وہ سارا علاقہ مسلمان ہو گیا۔ ''ہن نہ کوئی دریا ٹپن والا ہے نہ کوئی مسلمان ہوندا ہے''۔ کسی دور میں سامنا نہیں یہ کرنے والا ہوتا آپ دیکھیں گے'' حضرت صاحب جناں دا وصال ہو گیا ہوندا اے اوہناں دیاں داستاناں ساریاں ہوندیاں''۔ اس طریقے کے اوپر ایمان لانے والے اور اگر لائے تھے'' آ اسی بیٹھے ہوئے آں نا سارے فیر۔ یعنی ایہو جیا ایمان تے فیر ایہو جئے پیدا کردہ ہیگا۔ جُوں نے دَکھای جمنی اے ہور کی جمناں ہیگا''۔ ساری دنیا کی تو اہم پرستیاں' ساری دنیا کی جہالت' نکبت' زبوں حالی' ذلت' مسکنت ساری اس قوم کے اوپر مسلط۔ اگر وہ ٹھیک کہتے ہیں اور میں کہتا ہوں ٹھیک ہی کہتے ہیں اس طرح کے ایمان کا یہی نتیجہ ہو سکتا ہے۔ عزیزانِ من! نبی یہ چیزیں نہیں کرتا کسی معاملے کے اندر وہ کہیں کوئی چیز سپر نیچرل نہیں لاتا۔ صرف ایک وحی ہے جس کو وہ یہ کہتا ہے کہ یوں ملتی ہے۔ اس کو بھی اس بنا پہ نہیں منواتا کہ تم مانو کہ مجھے یہ ملتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ ہے جو کچھ ملا ہے مجھے' اسے لے جاؤ اور اس میں جا کے گھر پہ غور و فکر کرو پرکھ کے دیکھو عمل میں لا کے دیکھو۔ اگر یہ وہ کچھ کر دیتا ہے جو کچھ یہ کہتا ہے تو کہہ دو کہ یہ سچا ہے۔ سیدھی سی بات ہے کتنی RATIONAL APPROACH ہوتی ہے اس کی۔ اَلْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ غلبہ یہ پائے گا یہ نظام میرا جو ہے یہ دیا ہوا پروگرام ہمارا لیکن حکمت کی بنا کے اوپر۔ حکمت کے اندر جیسا میں نے عرض کیا ہے دلائل و برہان کی ذہنی طور کے اوپر RATIONALISM ' PRACTICALLY SCIENTIFIC طریق جسے آپ کہتے ہیں وہ ساری چیزیں اس میں آ جاتی ہیں۔ کہا دین تو یہ ہے۔ فَاِنْ تَوَلَّوْا (3:63) اور اگر اس کے بعد بھی پھر یہ روگردانی کرتے ہیں فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ (3:63) خدا خوب جانتا

ہے۔ دیکھیے کیا لفظ یہاں آیا ہے بِالْمُفْسِدِيْنَ (3:63) یہ کرامات اور خارقِ عادت طریقوں کے اوپر یہ کچھ ماننے والے فساد ہے انسانیت کا۔ سب سے پہلے تو ذہن میں فساد شروع ہوجاتا ہے۔ انسانی ذہن دلیل مانگتا ہے فکر مانگتا ہے INTELLECT اس کو دیا گیا ہے اس کو عقل دی گئی ہے اس کو علم دیا گیا ہے۔ اس کا تقاضا کچھ اور ہوتا ہے تو اہم پرستی کے عقیدے کا تقاضا کچھ اور ہوتا ہے ذہن میں ایک فساد شروع ہوجاتا ہے۔ اس کا عملی نتیجہ انسان کے معاشرے کے اندر برپا ہوتا ہے۔

ہماری زبوں حالی اور قدم قدم پر ذہنی انتشار کی بنیادی وجہ صرف متضاد خیالی ہے:

آپ دیکھ رہے ہیں آپ کی نسل میں آج کل ہو کیا رہا ہے؟ ایک طرف آپ ان کو بی اے کے سٹوڈنٹ کو آئن سٹائن پڑھاتے ہیں وہ خلانوردوں کو دیکھتا ہے اپنی آنکھ کے سامنے۔ اس سے اگلا پیریڈ دینیات کا شروع ہوجاتا ہے اس میں آپ یہ پڑھاتے ہیں کہ چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے ایک ادھر سے نکل گیا تھا ایک نکل گیا تھا اُدھر سے۔ اس کے ذہن میں فساد شروع ہوجاتا ہے۔ کیا بات ہے قرآن کی؟ ذہنی فساد سرکشی اختیار کر لیتا ہے اور وہ فساد معاشرہ کے اندر آ کے پھر آتش زنی اور آتش گیریوں میں آپ کے سامنے شروع ہوجاتا ہے۔ فساد ذہن سے پہلے شروع ہوتا ہے۔ کہا اس کے بعد بھی اگر پھر یہ پیٹھ پھیر کے چل دیتے ہیں گریز کی راہیں تراشتے ہیں نہیں مانتے۔ کوئی بات نہیں ہے اس قسم کے غیر فطری عقائد کی رو سے عیسائیت کے اندر فساد شروع ہوجائے گا۔

مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اٹھارویں صدی میں فسادات کی آگ کا منظر:

آپ کو معلوم ہے نا جو فساد شروع ہوا۔ سترہویں اٹھارویں صدی عیسوی میں ان کے ہاں سائنس رونما ہوئی فلسفہ آیا منطق آئی۔ ان علوم کی روشنی میں جب انہوں نے ان عقائد کو دیکھا بات مانتی نہیں تھی۔ ایک فساد شروع ہوا پورے معاشرے کے اندر۔ مذہب کی تو اہم پرستیوں نے اپنے اس اقتدار کی بنا پر یہ جو ہلہ کو پیچھے اپنے لگا کر حاصل کر لیتے ہیں فساد شروع کیا صاحب۔ قتل' غارت گری' زندہ جلا دینا' پھانسیوں پہ دے دینا۔ یہ شروع کیا چل نہیں سکا ہے۔ یہ رسیوں کے سانپ تو چل نہیں سکتے۔ اگلی ہی صدی کے اندر مجبور ہو کے انہیں یہ کرنا پڑا کہ ان سے کہنا پڑا ان پادریوں سے کہ بابا! تم گرجے کی چار دیواری میں تشریف لے جاؤ وہاں جو جی میں آوے بناؤ ان کو۔ باہر کی دنیا جو ہے انسانوں کی انسانوں کے ہاتھ میں چھوڑ دو۔ اپنے معاملات انہوں نے عقل وفکر کی رو سے نپٹانے شروع کیے ان کو وہاں بھیج دیا مذہب کو یوں رخصت کیا۔ یہ بھی ایک فساد ہے وحیٔ خداوندی سے محروم کر دینا۔ لیکن وحیٔ خداوندی وہاں ہوتی تو جب تھا وہ تو ساری ہی تو ہم پرستی تھی۔

پاکستان کی یہ پوری تاریخ آخر کس چیز کی عکاسی کر رہی ہے' علامہ غلام احمد پرویزؒ کی چیخ و پکار:

سوال یہ ہے کہ آپ کے ہاں کیا ہوا ہوا ہے؟ یہ جو بیس بائیس سال سے آپ کے ہاں مسلسل فساد چلا آ رہا ہے ذہنی اور فکری فساد' معاشرے کے اندر فساد کیوں ہے یہ چیز؟ اسی دور سے آپ گذر رہے ہیں جس دور سے یورپ سو سال پہلے گذرا

تھا۔ مذہب کی تو اہم پرستیاں مجبور کر رہی ہیں آپ کو وہ کچھ ماننے کے لیے جسے آپ کے ذہن کی فکر اور العلم جو ہے وہ صحیح نہیں سمجھتا ہے نوجوان رسی تڑا جاتا ہے۔ یہ بیٹھے ہوئے لعنتیں برسانے لگ جاتے ہیں انہوں نے سمجھا یہ تھا کہ ایسے وقت میں کرنا ہی یہ چاہیے۔ ماتھے پہ جفر کے نقشے بن رہے ہیں' منہ سے جھاگ نکل رہی ہے' آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں' کفر کے فتوے لگ رہے ہیں' بیویوں پہ طلاق پڑ رہی ہے' اس کے پیچھے نماز ناجائز' جنازہ نہیں پڑھنا اس کا چلا ہوا ہے یہ قصہ۔ اُدھر کا نوجوان جو ہے اس کے اندر فٹ نہیں بیٹھتی بات یہ۔ ایک کشمکش کے اندر مبتلا ہے آپ کا پورا معاشرہ۔ یہ وہی فساد ہے جو اس سے پیشتر ان قوموں میں گذر چکا ہے۔ عزیزانِ من! اسی لیے بیس برس سے میں چلا رہا ہوں کہ تاریخ سے عبرت پکڑو۔ [1]

اس خاک نشینی کا انجام اور اس سے بچنے کا طریق:

پہلا قدم اس کا یہ ہوگا کہ یہاں بھی آپ کے ہاں یہ ثنویت اور DUALISM آجائے گی۔ کہا جائے گا کہ جاؤ بابا! تم مسجدوں کی چار دیواری کے اندر جاؤ ہمیں اپنے معاملے خدا کے لیے عقل وفکر کی رو سے طے کرنے دو۔ یہ ثنویت آجائے گی دین گیا۔ اور اس ثنویت کا اگلا جو نتیجہ ہوگا وہ یہ کہ خوامخوہ کے لیے ان گرجوں کے اوپر ان پادریوں کے اوپر بجٹ کا کم از کم آدھا حصہ ان کے اوپر خرچ ہو جاتا تھا۔ انہوں نے کہا کہ جب معاشی بدحالی آتی ہے نکبت زبوں حالی' رشیا کے اندر پوری کی پوری فاقوں سے مر رہی تھی اور سب سے بڑی عیاشی جو تھی وہ گرجوں کے اندر ہو رہی تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ سلطنتیں ان پادریوں سے قرضہ لیتی تھیں' سب سے بڑے مہاجن ہوتے ہیں یہ مذہب پرست۔

انہوں نے کہا کہ یہ ایک مصیبت ہے سارے کے سارے کماتے ہیں یہ بیٹھے ہوئے اس طرح سے مہاجن بنے ہوئے کھاتے چلے جاتے ہیں۔ اور انہوں نے کہا کہ یہ تختۂ مسجد نہ قابلِ سوختن نہ قابلِ فروختن ہمارے کام کس آتا ہے۔ انہوں نے کہا لپیٹو اپنا بستر جاؤ وہاں یورپ کے اندر یہاں تمہارا کوئی کام نہیں ہے۔ مذہب ہی ختم ہو گیا رشیا کے اندر۔ عزیزانِ من! ڈرتا ہوں یہ جو فساد اس طرح سے برپا ہوتا ہے ذہن میں پھر معاشرے میں پہلا قدم اس کا وہ ہوگا جو یورپ میں ہوا۔ اور اب تو زمانہ برق رفتاری سے جا رہا ہے میں سمجھتا ہوں کہ شاید دو STAGES ہوں ہی نہ پہلا ہی قدم وہ ہو جائے جو ان ممالک کے اندر ہوا ہے جو روس اور چین کے اندر ہوا ہے۔

فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ (3:63) خدا جانتا ہے پھر اس کے بعد خوب واقف ہے کہ اس سے کیسا فساد پیدا ہوتا ہے اور اس فساد کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ علاج اس کا کیا ہے؟ ایک دعوت' عظیم دعوت تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ (3:64) اور یہ جو چیز ہے اس کی تفسیر آئندہ پہ میں اٹھا رکھتا ہوں کیونکہ آج وقت ہو گیا۔ سورۂ آلِ عمران کی آیت 62 تک ہم آ گئے۔

---

[1] علامہ پرویزؒ کی یہ آہ وفغاں 2010ء کی نہیں بلکہ یہ تو 41 سال پیشتر کی ہے۔

جمیل احمد عدیل

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِختلافِ قرأت کا افسانہ

ہم بھی کیا سادہ ہیں کہ اُس عہدِ زوال میں قرآن کی معنویت اور اہمیت ثابت کرنے کے لیے براہین پیش کر رہے ہیں جب ''ترکِ قرآن'' پر ملتِ بیضا متفق ہو چکی ہے بلکہ یوں کہیے قرآن کو ''مہجور'' بنا دینے پر ''اجماعِ اُمت'' ہو چکا ہے۔ چنانچہ کیا عجب قرآن کی بات کرنے والوں کو تفرقہ ڈالنے، مسلمات کو متنازع فیہ بنا دینے کے جرم میں رگیدا جائے۔ سچی بات ہے ہمیں اُن احباب کے حسنِ ظن پر حیرانی ہوتی ہے جن کا یہ مؤقف ہے کہ قرآن کی کوئی آیت منسوخ نہیں ہے۔ درآں حالیکہ معاملہ بالکل برعکس ہے۔ واقعتاً قرآن ''منسوخ'' ہو چکا ہے۔ جی ہاں پُورے کا پُورا قرآن ''منسوخ'' ہو چکا ہے۔

جس ریاست میں قرآنی نظام نہ صرف اپنی جزئیات کے ساتھ لاگو نہ ہو بلکہ جزوی طور پر بھی نافذ العمل نہ ہو وہاں بھلے حکمران شب و روز یہ مالا جپتے رہیں کہ قرآن ہمارا آئین ہے، قرآن ہمارا دستور ہے اور عوام بھی دِن رات اس وظیفے میں مشغول ہوں، قرآن ہمارا ضابطۂ حیات ہے، قرآن ہماری رہنما کتاب ہے۔ اس تسبیح سے کیا فرق پڑتا ہے؟

جی صاحبو! مذکورہ کورس کی گائیکی ''لِپ سروس'' سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ نیز پورے گلوب کا جائزہ لینے کے بعد کسی ایک مسلم ملک کا نام ہمیں ضرور بتائیے گا جو ''اِسلامک سٹیٹ'' ہو! اس تناظر میں یہ کہنا کہ قرآن ان لوگوں کے ہاتھوں عملاً منسوخ ہو چکا ہے، کیا غلط ہے؟

اصل سوال یہ ہے کہ قرآن مجید کو ''منسوخ'' کرنے والے ہیں کون؟ اس عظیم کتاب کی تنسیخ کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ اس باب میں ہماری رائے یہ ہے کہ حقیقی ذمہ دار وہ طبقہ ہے جس نے ریب والتباس سے منزّہ اس کتابِ ہدایت کو تشکیک وارتیاب کا مرکز بنا کر رکھ دیا۔ ایسے ایسے شکوک وابہام اس سے منسوب کر دیے کہ سچے قاری اس سے دُور ہوتے گئے۔ اس طرح قانون کی یہ کتاب پیشہ ور ''قاریوں'' کی کتاب بن کر رہ گئی۔ ان ہی کی پیروی میں عوام الناس بھی بے سوچے سمجھے عربی عبارت کی دہرائی کو موجبِ ثواب یقین کرتے ہوئے، اسی سعدِ عمل تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ حالانکہ قرآن پڑھنے والے پر اس کو سمجھنا ذمہ داری ہے اور اس پر عمل کرنا فرض ہے۔

یہ امر باعثِ حیرت بھی ہے اور وجۂ دلچسپی بھی کہ قرآن کے حوالے سے تمام تر شکوک وشبہات کا تعلق قرآن کی

داخلیات سے نہیں، قرآن کی خارجیات سے ہے۔ آپ اس پس منظر میں کسی ایک نزاعی بحث کی جانب معمولی سا اشارہ نہیں کر سکتے جو قرآن کی اندرونیات سے تعلق رکھتا ہو، ہر اعتراض، ہر مسئلہ بیرونیات سے جُڑا ہے۔ اگر کوئی صرف قرآن کا مطالعہ کرے تو کسی قدم پر لغزش کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ قطعاً کوئی ذہنی پیچیدگی پیدا نہیں ہوتی۔ اُصولِ تفسیر کے بیان میں ہمارے اکثر اکابرین نے دور کی کوڑیاں لانے میں جس مسابقت کا مظاہرہ کیا ہے، اس کی نظیر نہیں ملتی۔ ان تفصیلات اور اندیشہ ہائے دور دراز کی بجائے اگر اسی اصل الاُصول کو وہ نقطۂ ماسکہ کی حیثیت دیتے کہ قرآن کے سلسلہ میں غیر قرآن کو حَکَم (منصف) مقرر کرنا کسی طرح قابلِ قبول نہیں، تو موجودہ انتشار و افتراق کا نام و نشان تک نہ ہوتا۔

مثال کے طور پر اختلافِ قرأت کا خفی سا تذکرہ بھی قرآن کی دفتین میں کہیں موجود نہیں ہے۔ کون نہیں جانتا کہ موضوع مذکور پر ہمارے اسلاف و اخلاف نے بے شمار ضخیم کتب تصنیف کر رکھی ہیں اور اپنے تئیں ''علمِ قرأت'' کو فروغ دینے کی نیت سے ایسے ایسے دقیق نِکات پیش فرمائے ہیں کہ عقلِ اِنسانی ورطۂ حیرت میں غرق ہو ہو جاتی ہے۔ دوستو! یہ نکتہ کس درجہ عام فہم تھا کہ جب خود قرآن کہیں نہیں کہتا کہ اس کتاب کی ایک سے زائد قرأتیں ہیں، پھر ہمارے اکابر کو آخر اس موضوع پر اَن گنت تصانیف رقم کرنے کی ضرورت ہی کیا پڑی تھی؟

یہ جہت اپنی جگہ قابلِ توجہ ہے کہ علمی مسائل معتقدات کے مدار میں کیسے شامل ہو جاتے ہیں؟ اگر اختلافِ قرأت کا مسئلہ محض نظری یا علمی ہوتا تو شاید ایسی بڑی بات نہ تھی مگر ہمارے ہاں اسے باقاعدہ عقیدے کا مرتبہ حاصل ہو چکا ہے۔ ہماری دانست میں قرآن کی ''عملی منسوخی'' میں دو بنیادی اعتقادات کا حصہ ہے۔ ہم ایک بار پھر کہیں گے کہ مسلمان کو قرآن سے دور کرنے میں دو عقیدوں نے اساسی کردار ادا کیا ہے اور وہ یہ ہیں:

1۔ قرآن مجید کی بعض آیات منسوخ ہو چکی ہیں۔

2۔ قرآنِ مجید ایک سے زائد قرأتوں میں نازل ہوا تھا (قرأتوں کے نسخ کا عقیدہ اپنی جگہ طرفہ تماشا ہے!)

اچھا صاحبو! شروعات میں ہمارا نیک گمان یہی تھا کہ اکابرینِ اِسلام پر یہ محض اتہام ہے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ قرآن کے کسی حصے کو کوئی منسوخ قرار دے دے؟ نیز یہ کہے کہ بعض آیات قرآن مجید میں شامل ہونے سے رہ گئی ہیں۔ اس طرح تو پورے کے پورے قرآن کی معتبریت (CREDIBILITY) مشکوک ہو کر رہ جاتی ہے۔ لیکن بعد ازاں جب ہم نے اپنے بعض اکابر کی تحریریں خود پڑھیں تو یہ دیکھ کر نقشِ حیرت بن گئے کہ انہوں نے بڑے دھڑلے سے لکھا ہے کہ ہاں وحی کی ایک قسم وہ بھی ہے جو آپؐ پر اترنے کے بعد نہ صرف اذہان سے محو کر دی گئی بلکہ جن کاغذوں پر اُسے لکھ لیا گیا تھا وہاں سے اسے کسی غیبی طریقے سے DELETE بھی کر دیا گیا (اور ایسی ''قرآنی وحی'' کے نمونے بطور ثبوت آج بھی موجود ہیں۔ یاللعجب!) اسی طرح وحی کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ آج بھی قرآنِ مجید کے صفحات میں موجود ہے لیکن ان پر عمل نہیں کیا جائے گا۔ اس وحی کی صرف تلاوت ہو سکتی ہے (کیسی عجیب بات ہے (اللہ تعالیٰ معاف فرمائے!) کہ ہم اللہ کے سامنے ان

آیات کو پڑھتے ہوئے یہ یاددہانی بھی کرائیں گے کہ مولا! یہ آیات ہم یونہی ثواب کی غرض سے پڑھ رہے ہیں ان پر سیریس نہ ہوجانا۔) وحی کی تیسری شکل یہ ہے کہ وہ اتری تو بطور قرآن ہی تھی مگر ''بوجوہ'' وہ قرآن میں شامل ہونے سے رہ گئی۔ اس ''بوجوہ'' کا تعیّن بھی آج تک نہ ہوسکا' نہ اس کی حکمت سے اُمت کو آگاہ کیا گیا۔

گزشتہ دنوں فقیہہ العصر مفتی اعظم حضرت مولانا جمیل احمد صاحب تھانوی (مفتی جامعہ اشرفیہ) کی تالیفِ لطیف ''فرضیتِ رجم'' کا ہم مطالعہ کررہے تھے۔ جس میں حضرت صاحب موصوف نے ایک باب باندھا ہے: ''رجم کا ثبوت آیات سے۔'' اس کی ابتدائی سطور میں آپ فرماتے ہیں:

> ''اس میں شک نہیں کہ رجم کا ثبوت صاف قرآنی لفظوں میں ایسا نہیں جیسا جلد (کوڑے مارنے) کا ہے مگر بہت آیات سے یہ ماخوذ تو ہے۔ بیس (20) پیش کی جاتی ہیں اور صاف حکم ہونے کا نکتہ آیت نمبر 2 میں عرض ہے۔'' (ص 11)

ہم نے بے صبری سے ''صاف حکم'' والی آیت نکالی کہ ہمارے ناقص علم کے مطابق رجم کا ''صاف حکم'' قرآن میں نہیں تھا۔ لیکن جب یہ آیت دیکھی تو یہ سورۃ نور کی وہ مشہور آیت تھی جس میں کوڑے مارنے کا حکم تھا۔ رجم کا اس میں کہیں شائبہ بھی نہیں ملا۔ البتہ ص 22 پر ہمیں ''صاف حکم'' والی آیت مل گئی۔ جو ترتیب کے اعتبار سے چار نمبر آیت ہے لیکن مرتبے کے لحاظ سے ''دو نمبر آیت'' ہے کہ موصوف مولانا (جو غالباً مرحوم ہوچکے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے!) نے خود اس کے عربی متن کے نیچے قوسین میں یہ نوٹ لکھا ہے ''(منسوخ التلاوۃ' سورۃ احزاب میں تھی)۔''

اب ہمیں یہ تجسّس کہ آخر ایسی آیت جس کے حکم کو برقرار رکھنے پر حضرت عمرؓ تک مصر ہیں اور اس پر ''اجماعِ امت'' کی مقدس چھپی بھی لگی ہوئی ہے' آخر اس کے متن کو سورۃ احزاب میں رکھنے کے بعد خارج کیوں کردیا گیا؟ اور ایسا کس نے کیا؟ ہم نے سوچا کہ مولانا کے اسمِ گرامی کے ساتھ ''تھانوی'' ایسا معزز لاحقہ موجود ہے' یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ اپنے جدِ امجد کی تقلید میں ''احکامِ نقلیہ'' کے ''مصالح عقلیہ'' پیش نہ فرمائیں؟ اور ہم مایوس نہیں ہوئے کہ مولانا نے اس آیت:

> ''بڑا مرد اور بڑی عورت جب دونوں زنا کرلیں تو تم لوگ ضرور دونوں کو رجم کرو۔ اللہ کا عذاب قرار دے کر اور اللہ تعالیٰ غالب ہیں حکمت والے ہیں۔''

کے بعد اس کی عقلی توجیہہ ''نقلی انداز'' میں یوں فرمائی:

> ''رہا یہ سوال کہ آخر محصن (شادی شدہ) کی سزا کیوں بیان نہیں فرمائی؟ تو علامہ سیوطی شافعی نے اتقان میں اس کا نکتہ لکھا ہے کہ آیت الشیخ والشیخۃ کی تلاوت کیوں منسوخ ہوئی؟ کہ یہ امت پر تخفیفِ عظیم ہے کہ اس کی تلاوت اور مصاحف میں کتابت سے شہرت نہ ہو' اگرچہ اس کا حکم باقی رہے گا کہ یہ حکم ثقیل ترین اور سخت ترین اور اس کی حد بھی شدید ترین ہے۔''

آگے چل کر مولانا لکھتے ہیں:

''.....سخت ترین جرم کی سخت ترین سزا جو رجم ہے جس آیت میں اس کی تلاوت منسوخ فرمادی گئی اور دوسری آیتوں میں بھی صاف نہیں فرمائی گئی تاکہ قیامت تک کے لوگوں کے دنیا بھر میں سب سے زائد پڑھی لکھی جانے والی کتاب میں پڑھنے اور قرآنی نسخوں میں لکھے جانے سے اس کی شہرت نہ ہو اور اشرف المخلوقات میں سے خیر الامم میں ایسے واقعات ہونے کی شہرت سے ان کی بدنامی نہ ہو تو یہ اس امت پر رحم وکرم اور تخفیف وستاری فرمادی گئی ہے۔'' (ص 10-9)

کہیے جناب! کیا سمجھے ہیں؟ یہ ہوتی ہے ''عقلی'' توجیہہ! بصد معذرتِ جمال ہے جو خیر سے اس ''توجیہہ'' میں کہیں قرآنی معیارِ عقل کا گزر ہوا ہو۔ پہلا سوال تو یہ ہے' کیا اللہ تعالیٰ نے خود اسے ''وحیٔ متلو'' کے کھاتے سے نکال کر ''وحیٔ غیر متلو'' کے کھاتے میں درج کرایا؟ کیا رسولِ کریم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے ایسا کرنے کا حکم دیا؟ کیا اس آیت کی سختی کو صحابہؓ نے محسوس کرتے ہوئے امت کے لیے ''تخفیف'' کا اہتمام کیا؟ صحابہؓ اور رسولِ اکرمؐ تو ذاتی حیثیت میں یقیناً کر نہیں سکتے تھے کہ آیت اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائیں اور اس کی سختی اور ثقالت کو محسوس کرتے ہوئے وہ اسے قرآن سے خارج کر دیں۔ اور وہ بھی اس طرح کہ اس کے حکم کو باقی رکھیں لیکن اس کی لفظی ادائیگی کو ممنوع قرار دے دیں۔ باقی رہے خود خدا' تو خدا سے ڈر کے کہتے ہیں' ہمیں قرآن مجید میں ایسی کوئی آیت نہیں ملتی جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہو کہ سورۃ احزاب کی وہ رجم والی آیت جو میں عجلت میں پہلے بھیج چکا ہوں' اس پر عمل تو کیا کرو لیکن اس کی تلاوت نہ کیا کرو بلکہ اسے قرآن کے نئے ایڈیشن میں سے نکال دو۔

پھر ''تخفیف'' کا یہ انعام کس کی طرف سے ملا ہے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ آیت پہلے بھیج دی' سورۃ احزاب میں جگہ بھی پا گئی' جب تک اس سورۃ میں موجود رہی تلاوت بھی ہوتی رہی' حتیٰ کہ عجیب وغریب روایات کے مطابق بکری اسے کھا گئی لیکن اس کے باوصف آیت رجم آج بھی اپنے مکمل متن سمیت موجود ہے۔ قرآن میں نہ سہی' روایات کے خزینے میں سہی۔ سب سے بڑھ کر اسے من وعن OWN بھی کیا جا رہا ہے اور وقتِ ضرورت اسے پڑھا بھی جا رہا ہے۔

''تخفیف'' کیا ہوئی؟ جب اس کے مطابق عمل ہوگا تو کیا سنگساری کی سزا کے نفاذ کو دیکھ کر عینی شاہدوں پر خوف طاری نہیں ہوگا؟ کیا رجم کی عملی صورت دیکھ کر وہ دہشت زدہ نہیں ہوں گے؟ ظاہر ہے سزا دی ہی اس لیے جاتی ہے کہ باقی عبرت حاصل کریں۔ جب مولانا صاحب خود اسے سخت ترین جرم اور اِس کی سزا (رجم) کو سخت ترین سزا دے رہے ہیں تو قانون کی اس شق کے مطالعے (تلاوت) سے آخر اُمت کو نقصان کیا ہونا تھا؟ خدا شاہد ہے کہ ہم بحث برائے بحث یہ سوالات نہیں اٹھا رہے ہیں۔ اگر قرآن اور صاحبِ قرآن (صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم) سے سچا تعلق ہے تو کچھ غور کرو!

پھر اگر بعد میں ''تخفیف'' ناگزیر ہوگئی تھی تو اللہ تعالیٰ تو علیم مطلق ہیں' انہیں بعد میں جو اسے کینسل کرنا تھا' پہلے ہی نازل نہ کرتے..... اور پھر عمل بھی اس پر کرا رہے ہیں مگر ''حکم'' یہ ہے کہ اِسے قرآن میں سے نکال دو۔ کون ان سوالوں کا جواب دے گا؟

نیز یہ وضاحت بھی فرما دی جائے کیا قرآن میں سے باقی انذاری آیات نکال دی گئی ہیں؟ یا اس پہلو سے قرآن کا جائزہ لیا جا رہا ہے؟ یہ تو نام نہاد ''روشن خیالی'' کے ایجنڈے کا شاخسانہ محسوس ہو رہا ہے کہ جن جن آیات سے عوام کو دہشت کا احساس ہوتا ہے' نیز قرآن کی شہرت متاثر ہوتی ہے' نئے ایڈیشنوں میں سے انہیں نکال دیا جائے۔

سرِ دست ہم صرف ایک آیت کا ترجمہ درج کر رہے ہیں۔ دِل پر ہاتھ رکھ کر بتایئے کہ اس آیت کے مطالعے (تلاوت) سے زیادہ دہشت ہوتی ہے یا (مزعومہ) آیۂ رجم سے؟

> ''جو لوگ اللہ اور رسولؐ سے لڑائی کریں اور ملک میں فساد کرنے کو دوڑتے پھریں' ان کی یہی سزا ہے کہ قتل کر دیے جائیں یا سولی چڑھا دیے جائیں یا ان کے ایک ایک طرف کے ہاتھ اور ایک ایک طرف کے پاؤں کاٹ دیے جائیں یا ملک سے نکال دیے جائیں.....'' (سورۃ مائدہ آیت 32)

ویسے یہ مولانا مرحوم کا محض حُسنِ ظن تھا کہ یہ امت آیۂ رجم کی تلاوت سے خوفزدہ ہو جاتی لہٰذا اسے قرآن سے خارج کر دیا گیا۔ حالانکہ جس طرح قرآن کی تلاوت ہوتی ہے' اس میں کسی کو کچھ پتہ چلتا ہے کہ اس میں کیا لکھا ہے؟ جس طرح قسموں/حلفوں کے وقت قرآن اٹھایا جاتا ہے کہ اس سے کسی کو معلوم ہوتا ہے اس میں کیا لکھا ہے؟ جس طرح یہاں (عموماً) تراویح میں قرآن پڑھا جاتا ہے کیا امام و مقتدی کو خبر ہوتی ہے کہ کس آیت کا کیا مفہوم ہے؟ جس طرح عاملین تعویذ لکھ لکھ کر آیات کو بیچ رہے ہوتے ہیں کیا اس کے معانی جزوِ شعور بنانا اس ''عملیات'' کے نصاب میں شامل ہوتا ہے؟ ذرا سروے کر کے بتایئے گا کہ کتنے فی صد نمازی' نماز کے متن کے درست ترجمے سے آگاہ ہیں؟ جب بِن سمجھے ہی آیات کی تلاوت سے ثواب کی بارشیں نازل ہونی ہیں تو اُن آیات کو قرآن سے خارج کیوں کر دیا گیا جو پہلے قرآن میں شامل تھیں؟ اس طرح تو امت ثواب [1] کے وسیع اثاثے سے محروم ہوگئی ہے۔ باقی لگتے ہاتھ یہ تصریح بھی کر دیجیے کہ جو ترجمے کے ساتھ قرآن پڑھنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں' ان میں سے کتنے ہیں جو خوفزدہ کر دینے والی' تعزیری اور انذاری آیات کی تلاوت سے دہشت زدہ ہو کر مر گئے ہیں؟ کسی پر ان کے مطالعے سے کپکپی ہی طاری ہوئی ہو؟ ہمارا تو المیہ ہی یہی ہے:

وہ بتوں نے ڈالے ہیں وسوسے کہ دلوں سے خوفِ خدا گیا
وہ پڑی ہیں روز قیامتیں کہ خیال روزِ جزا گیا

اے کاش! قرآن پڑھتے ہوئے کسی کا قلب گداز ہو جائے! اے کاش! ہمارے حکام تلاوتِ قرآن کرتے ہوئے

---

[1] ثواب کا قرآنی مفہوم مروج مطلب سے یکسر مختلف ہے۔

اپنی ذمہ داریوں کے احساس سے چھلک پڑیں۔ جس روز ایسا ہو گیا تبدیلی آ جائے گی۔ اس انقلاب آفریں ساعت کی راہ میں ہماری سنگدلی ہی تو واحد رکاوٹ ہے کہ ہم نے قرآن کی آیات سے ڈرنا چھوڑ دیا ہے۔ اور مولانا (مغفور) ہیں کہ حد سے زیادہ رحم دِل ہوئے جا رہے ہیں کہ کسی طرح دہشت پھیلانے والی آیات کو قرآن کے سلیبس (SYLLABUS) سے خارج کرا دیں کہ اس طرح قرآن کی شہرت کو خطرات لاحق ہو سکتے ہیں (معاذ اللہ)!!!

پیارے قارئین! آج ہم ''ناسخ و منسوخ'' پر اظہارِ خیال کرنے نہیں جا رہے ہیں۔ یہ تو محض تمہید تھی۔ ہم قرآن سے دوری کی دوسری بنیادی وجہ یعنی ''اختلافِ قرأت'' کے خطرناک عقیدے پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ یہ موضوع بھی اہم ہے اور ہمارا یہ مضمون بھی کم اہم نہیں ہے۔ اس کی ''اکلوتی'' اہمیت یہی ہے کہ اس مشکل تر SUBJECT کو ہم آسان ترین اُسلوب میں پیش کر رہے ہیں تا کہ عام قاری بھی اس کی معنویت سے آگاہ ہو جائے اور کسی طرح وہ کتاب اللہ سے پھر جڑ جائے۔

بطور پس منظر ہم یہ ضرور عرض کریں گے کہ اس حوالے سے ہم نے اپنے گرد و پیش میں بے طرح پھیلے ہوئے صلحا سے استفسارات بھی کیے لیکن وہ صالحین حد سے زیادہ سادہ ثابت ہوئے کہ اس موضوع پر رسمی کلام ہی کر سکے۔ حالانکہ ہم انہیں کافی پڑھا لکھا سمجھنے کے گمان میں گرفتار تھے۔ مثال کے طور پر ان میں سے ایک صالح نے فرمایا:

> اختلافِ قرأت سے مراد یہ ہے کہ قرآن کو سات مختلف لہجوں میں پڑھا جا سکتا ہے اور یہ صرف لب و لہجے کا فرق ہے۔ اس طرح قرآن کو پہلے بھی ان لہجوں میں پڑھا جا سکتا تھا۔ آج بھی اس کی اجازت ہے اور یہ ادائیگی معانی میں قطعاً کوئی فرق نہیں ڈالتی۔ ہم نے کہا' حضور! کہا یہ جاتا ہے قرآن سات قرأتوں میں ''نازل'' ہوا ہے اور ''نازل'' کے معانی آپ جانتے ہیں کہ قرآن اللہ نے سات قرأتوں میں نازل فرمایا ہے۔ غصے میں آ کر بولے، نازل کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ نے سات قرأتوں میں اتارا ہے۔ اس نے ایک ہی طرح اتارا ہے۔ ہاں سات عربی لہجے پہلے سے موجود تھے' انہیں اپنے اپنے لہجے میں پڑھنے کی اجازت دے دی گئی۔ بس یہی ہے ''نازل ہونے'' کا مفہوم۔ ہم نے عرض کیا؛ کیا اختلافِ قرأت میں لفظوں کا فرق بھی شامل ہے؟ طیش میں آ گئے یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ بھلا ایک سے زائد الفاظ چاہے وہ مترادف ہی کیوں نہ ہوں' کیوں کر بھیجنے لگا؟ او میاں! صرف لب و لہجے کا فرق ہے اور وہ بھی معمولی۔ بس اختلافِ قرأت سے یہی مطلب ہے۔

ہمیں ان کی سادگی پر ترس آیا اور بھولپن پر پیار! اسی طرح عربی کے ایک فاضل پروفیسر صاحب سے بھی اس حوالے سے پوچھا۔ وہ بھی کوئی تشفی بخش جواب نہ دے سکے بلکہ بڑی معصومیت سے فرمانے لگے کہ آپؐ پر وحی کا مفہوم ہی

اتر تا ہوگا' لفظ تو آپ کے اپنے ہی ہوں گے۔ سو ان سے گفتگو آگے کیا بڑھتی؟ البتہ انہوں نے اگلے دِن ہمیں لبنان کے مصنف ڈاکٹر صُبحی صالح کی تصنیف ''علوم القرآن'' لا کر دے دی کہ اس مسئلے پر ایک چیپٹر ہے' پڑھ لو' ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

ایک اور عربی دان' زہد و ورع کے مدعی اسلامیات کے معمر پروفیسر صاحب سے پوچھا تو انہوں نے یہ کہہ کر جان چھڑالی کہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ کی ''معارف القرآن'' کی پہلی جلد میں بڑی مفید معلومات درج ہیں' اس کا مطالعہ کرلو' انشاءاللہ شفا ہوگی!

قصہ مختصر اپنی ذہنی استعداد کے مطابق ہم نے یہ دونوں آرٹیکلز بالاستعیاب پڑھ ڈالے۔ ہماری یہ مجمل سی تحریر درحقیقت انہی آرٹیکلز پر اجمالی تبصرے کی حیثیت رکھتی ہے۔ محولہ دونوں ہستیاں اختلافِ قرأت کے حوالے سے ''اقبالی'' ہیں۔ یعنی وہ غیر مبہم الفاظ میں اقرار کرتے ہیں کہ ہاں قرآن مجید ایک سے زائد قرأتوں میں نازل ہوا تھا۔

ظاہر ہے اس مخصوص THESIS کی ایک اساس ہے اور یہ اساس خود قرآن مجید نہیں۔ اس لیے کہ پورے قرآن میں اختلافِ قرأت کے حوالے سے کوئی اِشارہ بھی نہیں ملتا۔ یہاں بھی DISPUTE وہی ہے:

آیات vs روایات

ہمارے علما کو چونکہ متداول ''طرق و اسانید'' ہمیشہ سے CONFUSE کرتے آئے ہیں فلہٰذا یہاں بھی انہیں بعض روایتوں کی وجہ سے ہزاروں تاویلیں کرنی پڑی ہیں۔ اس ضمن میں روایات تو متعدد ہیں' تاہم بخاری شریف کی ایک روایت ایسی ہے جسے اس سلسلے میں لازماً QUOTE کیا جاتا ہے۔ پہلے ہم اپنے پاس موجود صحیح بخاری شریف کے نسخے میں سے وہ نقل کرتے ہیں:

> ''عروہ بن زبیر نے حضرت مسور بن مخرمہ اور حضرت عبدالرحمن بن عبدالقاری سے روایت کی کہ ان دونوں حضرات نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا کہ میں نے حضرت ہشام بن حکم کو رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی حیاتِ مبارکہ میں سورۃ الفرقان پڑھتے ہوئے سنا۔ جب میں نے ان کی قرأت سُنی تو وہ کتنے ہی ایسے حروف کے ساتھ پڑھ رہے تھے جس طرح رسول اللہ ﷺ نے مجھے نہیں پڑھائے تھے۔ قریب تھا کہ میں نماز میں ہی ان پر حملہ کر دیتا لیکن میں نے صبر کیا' یہاں تک کہ انہوں نے سلام پھیر دیا۔ میں نے ان کی چادر ان کے گلے میں ڈال کر کہا کہ جو سورۃ میں نے آپ کو پڑھتے ہوئے سنا یہ آپ نے کس سے پڑھی ہے؟ کہا کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے پڑھائی ہے۔ میں نے کہا کہ آپ جھوٹ بولتے ہیں۔ جس طرح آپ پڑھ رہے ہیں مجھے تو اس سے الگ انداز پر پڑھائی ہے۔ پس میں انہیں کھینچتا ہوا رسول اللہ ﷺ کی طرف لے چلا۔ میں عرض گزار ہوا کہ میں نے انہیں سورۃ الفرقان ایسے انداز میں پڑھتے ہوئے سنا ہے جس طرح آپؐ نے مجھے

نہیں پڑھائی۔ ارشاد فرمایا کہ انہیں چھوڑ دو۔ اے ہشام! پڑھو۔ چنانچہ انہوں نے اُسی طرح پڑھی جیسے میں نے اُن سے سُنی تھی۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اسی طرح نازل ہوئی ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اے عمر! تم پڑھو۔ پس میں نے اسی طرح پڑھی جیسے مجھے پڑھائی تھی۔ فرمایا کہ اسی طرح نازل ہوئی ہے' بے شک قرآن مجید سات طریقوں پر نازل ہوا ہے۔ پس اسی طریقے سے پڑھو جس کے لیے جو طریقہ آسان ہے۔'' (جلد سوم' ص 907)

مذکورہ نزاع کا حتمی زمانی تعیّن کافی مشکل ہے۔ تاہم سورۃ الفرقان کب نازل ہوئی؟ یہ ایک حد تک معلوم کیا جا سکتا ہے۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ متذکرہ سورۃ مدنی ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ اس کی تین آیات مدنی ہیں' باقی سورۃ مکہ شریف میں نازل ہوئی۔ جمہور کا مؤقف یہ ہے کہ سورۃ فرقان مکی ہے اور مکی دور کے آخر میں اتری۔ تاریخ بتاتی ہے حضرت عمرؓ نے نبوت کے چھٹے سال اِسلام قبول کیا۔ حضرت عمر فاروقؓ مکہ کے سترہ پڑھے لکھے افراد میں شامل تھے۔ اس لیے یہ ہو نہیں سکتا کہ وہ آیاتِ قرآنی سے ناواقف ہوں۔ چلیے مان لیا قبولِ اسلام سے پہلے وہ اختلافِ قرأت ایسی جزئیات سے آگاہ نہیں ہوں گے' لیکن آپؓ کے قبولِ ایمان کے کوئی چھ برس بعد سورۃ فرقان نازل ہوتی ہے اور اس وقت تک جناب عمرؓ جیسا بالغ نظر' باریک بین اور جہاندیدہ شخص اس حقیقت سے بے خبر ہے کہ قرآن سات مختلف قرأتوں میں نازل ہو رہا ہے۔

اگر حضرت عمرؓ یہ جانتے ہوتے تو کبھی حضرت ہشامؓ سے جھگڑا نہ کرتے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ نزولِ قرآن کے کم و بیش بارہ برس بعد حضرت عمرؓ جیسا خاص الخاص رفیقِ رسولؐ اتنی اہم بات سے یوں لاتعلق ہو؟ وہ عمر فاروقؓ جس کے متعلق یہاں تک کہا جاتا ہے کہ قرآن کی کئی آیات ان کی رائے کی تائید میں اتریں بلکہ ایک مقام پر یہ تک کہا گیا کہ قرآن کے صحیح مفہوم سے حضرت عمرؓ رسولِ کریمؐ سے بھی زیادہ آگاہ ہوتے تھے۔ جی جناب! ایک جانب ایسی مبالغہ آرائی اور دوسری طرف ایسی بے خبری! کوئی نکتہ ور ہی اس گرہ کو کھول سکتا ہے۔ باقی بھلے راوی کیسے ہی مستند کیوں نہ ہوں میرے رسولؐ قرآن کے خلاف کبھی نہیں جا سکتے۔

اب یہ توضیح بھی ناگزیر ہے کہ آخر سات قرأتوں سے مراد کیا ہے؟ سات قرأتوں کو ''حروفِ سبعہ'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس حوالے سے بھی صورتِ حال غیر معمولی ''باعثِ رحمت'' ہے کہ اُمت اس کی تعریف کے سلسلے میں ٹھیک ٹھاک اختلاف کا شکار ہے [1]۔ صبحی صالح لکھتے ہیں:

> ''حرف سبعہ کے معنی و مفہوم کی تعیین کے بارے میں علما نے مختلف و متضاد افکار و آرا کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ بعض علما نے اس ضمن میں پینتیس (35) اور بعض نے چالیس (40) اقوال ذکر کیے ہیں۔'' (علوم القرآن' ص 147)

---

[1] میرے آقا یگانگت کی پیاری تعلیم لے کر تشریف لائے تھے' اختلافات کو رحمت قرار دینے کے لئے مبعوث نہیں ہوئے تھے۔

پھر یہ بحث بھی مرکزِ تکلّم بنی کہ آیا سات سے مراد SEVEN ہے یا اس کا مطلب کثرت ہے؟ ظاہر ہے یہاں بھی غیر قرآنی علما دو فرقوں میں بٹ گئے۔ سوئے اتفاق! اتفاق یہ صرف کفر کے فتوے پر ہی کرتے ہیں یا دعوت سمرقند پر۔ لیکن یہ اگلے دِن پھر دعوتِ سمرقند پر ہی جمع ہوتے ہیں۔ فاقے کی تو کیا دعوتِ شیراز کی بھی نوبت نہیں آنے دیتے۔ الہم زد فزد!

ڈاکٹر صبحی صالح کا مؤقف ہے کہ سات سے مراد سات یعنی خاص عدد 7 مراد ہے جبکہ مرحوم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع علیہ الرحمۃ نے سات کے عدد میں قید ہونا پسند نہیں کیا۔ وہ دس سے چودہ قرأتوں تک پہنچے ہیں۔ جس طرح روایات عجیبہ کی رُو سے نمازوں کی فرضیت کے وقت پچاس سے ہوتے ہوئے پانچ پر معاملہ طے پایا تھا۔ اسی طرح قرأتوں کے حوالے سے بھی ایک سے شروع ہو کر سات پر پہنچا گیا ہے۔ لیکن کیا ہے کہ آیات ایسی روایات کی تصدیق نہیں کرتیں۔ مولانا مفتی محمد شفیعؒ نے ''معارف القرآن'' کی جلد اوّل کے صفحہ 30 پر یہ روایت درج کی ہے:

> ''صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم ایک مرتبہ بنو غفار کے تالاب کے پاس تشریف فرما تھے کہ حضرت جبرائیل علیہ السّلام آ گئے اور انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو حکم دیا ہے کہ آپؐ اپنی امت کو حکم دیں کہ وہ قرآن کو ایک ہی حرف پر پڑھے۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں اللہ سے اس کی معافی اور مغفرت طلب کرتا ہوں' میری امت میں اس کی طاقت نہیں ہے' پھر جبرائیل علیہ السّلام دوبارہ آپؐ کے پاس آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو حکم دیا ہے کہ آپؐ کی امت قرآن کریم کو دو حرفوں پر پڑھے۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت مانگتا ہوں۔ میری امت میں اس کی بھی طاقت نہیں ہے۔ پھر وہ تیسری بار آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو حکم دیا کہ آپؐ کی امت قرآن کریم کو تین حرفوں پر پڑھے۔ آپؐ نے پھر فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت چاہتا ہوں' میری امت میں اس کی بھی طاقت نہیں ہے۔ پھر وہ چوتھی بار آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو حکم دیا ہے کہ آپؐ کی امت قرآن کو سات حروف پر پڑھے پس وہ ان میں سے جس حرف میں پڑھیں گے ان کی قرأت درست ہوگی۔''

مفتی صاحب مرحوم نے اس کی تائید کی ہے کہ قرآن کریم کی قرأتیں اللہ تعالیٰ نے خود نازل فرمائی ہیں۔ علامہ غلام رسول سعیدی نے ''تبیان القرآن'' کی جلد نمبر 8 کے صفحہ نمبر 204 پر لکھا ہے:

''حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی متوفی 852ھ لکھتے ہیں:

> سات حروف میں قرآن مجید کو نازل کرنے کی حکمت یہ تھی کہ پڑھنے والے کے لیے آسانی ہو اور پڑھنے والا ایک لفظ کی جگہ اس کے مترادف کو پڑھ سکے خواہ یہ سات حروف ایک ہی لغت

سے ہوں۔ کیونکہ حضرت ہشامؓ اور حضرت عمرؓ دونوں کی ایک ہی لغت تھی اور وہ لغت قریش تھی۔ اس پر حافظ ابن عبدالبر نے متنبہ کیا ہے کہ انہوں نے کہا سات حروف سے مراد یہ ہے کہ لغت قریش کے سات مترادفات تک قرآن مجید کو پڑھا جا سکتا ہے اور اکثر اہلِ علم کا یہی مختار ہے۔''

آگے چل کر سورۃ ابراہیم کی آیت نمبر 4 درج کی گئی ہے۔

''ہم نے ہر نبی کو اس کی قوم ہی کی زبان میں بھیجا ہے۔''

اس سے استنباط کرتے ہوئے دلیل لائی گئی ہے کہ اس کا تقاضا ہے کہ یہ تمام لغات قریش کے قبائل کی ہوں۔

اب گفتگو بڑے دلچسپ مرحلے میں داخل ہو رہی ہے کہ وضع کردہ روایات کے مطابق حضورؐ نے بار بار التماس کر کے اللہ تعالیٰ سے سات حروف کی اجازت حاصل کی۔ صرف اس لیے کہ امت ایک ہی حرف (قرأت) پر قرآن پڑھنے سے عاجز تھی۔ آپ بتایئے کہ یہ عجز قبیلہ قریش میں زیادہ مسئلہ بن سکتا تھا یا دیگر قبائل عرب میں؟ یعنی غیر قریش پابند تھے کہ وہ قرآن کو قریشیوں کی لغت میں ہی پڑھیں (چاہے وہ اس لغت میں پڑھنے میں کیسی بھی دقت کیوں نہ محسوس کریں) لیکن خود قریشی سات مترادفات میں سے کسی کو بھی منتخب کرنے میں آزاد تھے۔

خشت اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

کتنی عجیب بات ہے کہ جن کے لیے حقیقی مشکل تھی، ان کے لیے کوئی آسانی نہیں رکھی گئی اور جو اسے اپنی زبان کے کارن آسانی سے پڑھ سکتے تھے انہیں اجازت دے دی گئی کہ لو بھئی! ہم اس قرآن کو سات مترادف الفاظ میں اتار رہے ہیں، جس میں سہولت محسوس کرو پڑھ لیا کرو۔ خدارا! دل پر ہاتھ رکھ کر کہیے کہ کیا یہ روایات حضور نبی اکرمؐ سے محض منسوب نہیں ہیں؟ بھلا اس اختلاف کی اینٹ آپؐ اپنے ہاتھ سے کیسے رکھ سکتے تھے؟

دوستو! آپ کو لفظ ''مترادفات'' کے بار بار استعمال سے یہ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ''حروفِ سبعہ'' کی ایک INTERPRETATION بہرحال یہ بھی ہے کہ مفہوم کو تبدیل کیے بغیر متبادل الفاظ کے ذریعے ادا کیا جا سکتا ہے۔ سوال لوٹ کر پھر آتا ہے کہ کیا وہ سات مترادف الفاظ خود خدا نے اتارے تھے یا اس نے (چلیے قریش کو ہی سہی) خود صوابدیدی اختیار دے رکھا تھا کہ اس وحی ربانی کو اُن الفاظ سے پڑھ پڑھا لیا کرو جو تمہارے حساب میں آئیں؟

ایک جانب وہ روایت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اللہ نے اسے سات حرفوں پر اتارا ہے۔ دوسری طرف یہ روایات ہے:

''اے عمرؓ! قرآن میں ہر طرح کے الفاظ کا استعمال درست ہے بشرطیکہ تو رحمت کی جگہ عذاب

اور عذاب کی جگہ رحمت کا لفظ نہ رکھ دے۔'' (تفسیر ابن جریر' جلد اوّل' ص 10)

اس روایات سے مترشح ہوتا ہے کہ الفاظ کا انتخاب قاری کی صوابدید پر مبنی تھا۔ اللہ نے ایک ہی حرف پر قرآن اتارا تھا۔ ان تضادات کو کون حل کرے گا؟

ڈاکٹر صبحی صالح تسلیم کرتے ہیں:

''یہ بات دلائل صحیحہ سے معلوم ہو چکی ہے کہ سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے آغازِ اسلام میں وسعت و سہولت کے پیشِ نظر مسلمانوں اور خاص طور پر بوڑھے مردوں اور عورتوں کو اس بات کی اجازت دی تھی کہ وہ قرآن کریم کو اپنی زبان کے مطابق پڑھ لیا کریں۔ اس لیے کہ دوسری زبان میں پڑھنے سے مشقت کا سامنا ہوتا ہے۔'' (ص 154)

اس کے آگے ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''اس کے یہ معنی نہیں کہ آنحضورؐ ان کو اس بات کی اجازت دیتے تھے کہ ان قرأتوں کو قرآنی الفاظ کی طرح مصاحف میں لکھ لیں۔'' (ص 154)

جناب علامہ غلام رسول سعیدی نے قاسم بن ثابت کے حوالے سے اس نقطۂ نظر کی تائید کی ہے۔

''اس طرح قرآن مجید کو پڑھنے کی رخصت اس وقت تھی جب قرآن مجید کو لکھا نہیں جاتا تھا اور اس کا رسم الخط متعیّن نہیں ہوا تھا۔'' (تبیان القرآن' جلد 8' ص 205)

دوستو! اس سے یہ ثابت ہوا کہ سورۃ فرقان کے نزول کے وقت تک اس کی اجازت تھی بلکہ باقاعدہ اجازت اس وقت دی جا رہی ہے۔ یعنی نزولِ قرآن سے گیارہ بارہ برس بعد تک قرآن تحریری صورت میں موجود ہی نہیں تھا؟ حالانکہ حضرت عمرؓ کے قبولِ اسلام کا جو واقعہ زیادہ مشہور ہے' اس کے تعلق میں بتایا جاتا ہے کہ ان کے بہنوئی نعیم ابن عبداللہ اور ان کی اہلیہ یعنی حضرت عمرؓ کی بہن جس صحیفے کی تلاوت کر رہے تھے اس میں سورۃ طٰہٰ' سورۃ حدید اور دیگر سورتیں درج تھیں۔ سو یہ کہنا کہ یہ اجازت تب تھی جب قرآن ضبطِ تحریر میں آنا شروع نہیں ہوا تھا بالبداہت غلط ہے۔

آگے چلیے' پنبہ کجا کجا نہم! لوگ کب تک مختلف قرأتوں میں قرآن شریف پڑھتے رہے؟ مفتی محمد شفیع مرحومؒ سے پوچھتے ہیں:

''شروع میں چونکہ لوگ قرآنِ کریم کے اُسلوب کے پوری طرح عادی نہیں تھے اس لیے ان سات اقسام کے دائرے میں بہت سی قرأتوں کی اجازت دے دی گئی تھی' لیکن آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا معمول تھا کہ ہر سال رمضان میں جبرائیل علیہ السّلام کے ساتھ قرآن مجید کا دورہ کیا کرتے تھے۔ جس سال آپؐ کی وفات ہوئی اس سال آپؐ نے دو مرتبہ دورہ

فرمایا۔اس دور کو ''عرضۂ اخیرہ'' کہتے ہیں اس موقع پر بہت سی قرأتیں منسوخ کر دی گئیں اور صرف وہ قرأتیں باقی رکھی گئیں جو آج تک تواتر کے ساتھ محفوظ چلی آتی ہیں۔'' (معارف القرآن، جلد اوّل، ص 32)

سبحان اللہ! ایک نہایت ثقہ عالم فرما رہے ہیں کہ ان قرأتوں کی اجازت ترقیمِ قرآن سے قبل تک تھی۔ دوسرے معتبر ترین عالم کا فرمان ہے کہ سالِ وصال نبیؐ میں جا کر ''بہت سی قرأتیں'' منسوخ ہوئیں۔ حالانکہ اس وقت مکمل قرآن ضبطِ تحریر میں آ چکا تھا۔

پیارو! یہ کہانی یہاں ختم نہیں ہوتی۔ مفتی صاحبؒ نے کہنے کو تو یہ کہہ دیا کہ سالِ وفات میں بہت سی قرأتیں منسوخ ہو گئیں اور جو باقی رہ گئیں وہ آج تک تواتر کے ساتھ محفوظ ہیں یعنی ان کی اجازت ہے۔

ہم یہ پوچھتے ہیں پھر حضرت عثمانؓ نے جس ایک قرأت پر اُمت کو جمع کیا تھا، وہ کیا قصّہ تھا؟ اگر قرأتیں باقی ہیں تو حضرت عثمانؓ کو جو جامع القرآن کا کریڈٹ دیا جاتا ہے وہ کس بات پر ہے؟

یہ بھی ایک فلسفہ ہے، ایک سائنس ہے۔ مرحوم مفتی صاحبؒ فرماتے ہیں:

''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تلاوتِ قرآن کے معاملے میں غلط فہمیاں رفع کرنے کے لیے اپنے عہدِ خلافت میں قرآن کے سات نسخے تیار کرائے اور ان سات نسخوں میں تمام قرأتوں کو اس طرح سے جمع فرمایا کہ قرآن کریم کی آیتوں پر نقطے اور زیر و زبر پیش نہیں ڈالے تاکہ انہیں مذکورہ قرأتوں میں سے جس قرأت کے مطابق چاہیں پڑھ سکیں۔ اس طرح اکثر قرأتیں اس رسم الخط میں سما گئیں اور جو قرأتیں رسم الخط میں نہ سما سکیں، ان کو محفوظ رکھنے کا طریقہ آپؓ نے یہ اختیار فرمایا کہ ایک نسخہ آپ نے ایک قرأت کے مطابق لکھا اور دوسرا دوسری قرأت کے مطابق۔ امت نے ان نسخوں میں جمع شدہ قرأتوں کو یاد رکھنے کا اس قدر اہتمام کیا کہ علمِ قرأت ایک مستقل علم بن گیا۔'' (معارف جلد اوّل ص 32)

اب سر پکڑ کا بیٹھ جایئے کہ ان تناظرات میں نکات ہی بڑے عجیب و غریب ترتیب پا رہے ہیں۔

(1) قرأتیں سات تھیں۔

(2) رسولؐ خدا نے خدا سے جھگڑ کر، منت سماجت کر کے سات کروائی تھیں وگرنہ قرأت ایک ہی تھی۔

(3) ان کی اجازت صرف اس وقت تھی جب تک قرآن لکھا نہیں جا رہا تھا۔

(4) اس سہولت سے صرف قریش مستفیض ہو سکتے تھے، غیر قریش قبائل نہیں۔

(5) محققین نے دوسرے قبائل کی لغت بھی قرآن میں دریافت کر کے دکھا دی ہے۔

(6) سال وفات بہت سی قرأتیں منسوخ ہوگئیں۔

(7) بہت سی قرأتیں منسوخ ہونے کے باوجود وہ سات کی سات رہیں کہ حضرت عثمانؓ نے ساتوں قرأتوں کو ''ایک قرآن'' میں ضم کردیا۔

(8) اور وہ ساتوں قرأتیں جب حضرت عثمانؓ سے ایک قرآن میں ضم نہ ہوسکیں تو آپؓ نے سات قرآن تیار کرائے۔ ہر قرآن الگ قرأت میں تھا۔

(9) سات سے مراد سات ہی کا عدد ہے۔

(10) سات سے مراد کثرت ہے۔

(11) سات سے مراد قریش کے سات لغت ہیں۔

(12) سات سے مراد غیر قریش سمیت سات لغات ہیں۔

(13) سات قرأتوں سے مراد سات نوعیتیں ہیں۔

(14) سات قرأتیں صحیح سات قرأتوں کا محض ایک حصہ ہیں۔ ورنہ ہر وہ قرأت جو مذکورہ بالا تین شرائط پر پوری اترتی ہو صحیح قابلِ قبول اور سات حروف میں داخل ہے جس پر قرآن کریم نازل ہوا۔

(15) سات سے مراد دس اور چودہ قرأتیں ہیں۔

(16) امام مازری کے بقول تمام مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ ایک آیت کو اس جیسی دوسری آیت سے بدل کر پڑھنا حرام ہے اور جس نے کہا کہ غفور رحیم کو سمیع بصیر سے بدل کر پڑھنا جائز ہے۔ اس کا قول بھی فاسد ہے کیونکہ مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ قرآن مجید کو متغیّر کر کے پڑھنا حرام ہے۔

اب امام صاحب سے کون پوچھے کہ آج متغیّر کر کے پڑھنا حرام کیوں ہے؟ اور اس وقت حلال کیوں تھا؟ آخر اس حرمت اور حلت کی کوئی علت بھی ہے یا نہیں؟

ظاہر ہے اب کوئی یہ ہمت نہیں کرتا کہ وہ قرآن کے لفظوں کو دوسرے عربی لفظوں سے بدل کر اسے قرآن کہے! (ترجمے کی بات اور ہے کہ ترجمے کو ترجمہ ہی کہا جاتا ہے۔ اسے اصل قرآن کوئی نہیں کہتا۔ مارماڈیوک پکتھال، علامہ محمد اسد، احمد علی، مولوی محمد علی نے بہترین انگریزی ترجمے کیے ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک! مگر اپنی ذات میں ہر ایک انگلش ٹرانسلیشن ہی ہے، قرآن نہیں کہ اصل قرآن اپنے عربی متن کے ساتھ ایک ہی ہے۔ ہمیشہ سے یہی تھا، ہمیشہ یہی رہے گا)۔

جملہ قارئینِ اختلافِ قرأت اسی طرف گئے ہیں کہ شروعات میں متبادل مترادف الفاظ میں قرآن پڑھنے کی اجازت تھی۔ پھر اس اجازت کو ختم کیوں کر دیا گیا؟ ہمارے اکثر علما نے اس اختلافِ قرأت کے نتیجے میں پیدا ہونے والے تفرقے کو مٹانے کا کریڈٹ حضرت عثمانؓ کو دیا ہے۔ لیکن اپنے حضرت مولانا مودودیؒ حضرت عثمانؓ سے سخت برافروختہ

ہیں۔ان کا نقطۂ نظر ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اپنی حد سے تجاوز کیا ہے کہ جو کام حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے نہیں کیا حضرت عثمانؓ نے کیوں کیا؟ نیز جب ایسا کوئی حکمِ منسوخی خدا نے کبھی نازل نہیں کیا تھا تو حضرت عثمانؓ نے یہ STEP کیوں لیا؟ (مفہوم)

جن اصحاب کو اس موضوع سے دلچسپی ہے وہ مولانا مفتی محمد شفیعؒ کی ''علوم القرآن'' جناب علامہ غلام رسول سعیدی کی ''تبیان القرآن'' ڈاکٹر صبحی صالح کی ''علوم القرآن'' اور دیگر تفاسیر وغیرہ پڑھ لیں جس میں بڑے ہی رنگا رنگ گل کھلائے گئے ہیں۔ اور بالتفصیل مختلف قرأتیں بیان کی ہیں۔ یہاں ہم ڈاکٹر صالحی کو ضرور QUOTE کریں گے جنہوں نے اختلافِ قرأت کی سات اقسام بیان کی ہیں:

> ''سابقاً ذکر کردہ سات اقسام میں سے آخری قسم یعنی ''اختلافِ لہجات'' کی اہمیت کے پیشِ نظر بعض علما نے حروفِ سبعہ کو لہجہ کے مختلف اقسام میں محدود کر دیا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ بعض علما نے ازرہِ غفلت اس آخری قسم کا ذکر تک نہیں کیا..... ہمارے نزدیک یہ دونوں نظریات مبالغہ پر مبنی ہیں۔ یہ بات کسی طرح موزوں نہیں کہ سابقاً ذکر کردہ چھ اقسام کو اہم ہونے کے باوصف نظر انداز کر کے صرف ساتویں قسم کا ذکر کیا جائے۔ اسی طرح آخری قسم کی اہمیت مسلّم ہے.....لہٰذا آخری قسم کو نظر انداز کر کے باقی چھ اقسام کا ذکر کرنا کسی طرح قرین قیاس نہیں۔'' (علوم القرآن، ص 165)

ڈاکٹر صاحب غالباً نہیں یقیناً کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اختلافِ قرأت سات قسموں پر مشتمل ہے۔ وہ پارسا جو یہ کہتے ہیں کہ یہ محض لب و لہجے کا فرق ہے، بالکل ناانصافی سے کام لیتے ہیں۔ اسی طرح جو اس فرق کو فہرست میں سے سرے سے ہی خارج کر دیتے ہیں اور باقیوں پر زور دیتے ہیں، وہ بھی عدل کے منافی سوچ رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا اپنا ایک اندازِ فکر ہے لیکن ہم اُن کی اس اعتبار سے تائید ضرور کریں گے کہ اب نیک گمان رکھنے والے صلحا نے پردہ پوشی کی عجیب فعلیت اختیار کر رکھی ہے کہ بڑی سہولت سے اتنا کہہ کر شانت ہو جاتے ہیں کہ اختلافِ قرأت کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ یہ تو جناب! مختلف افراد کے لب و لہجے کا معمولی اختلاف ہے۔ وگرنہ اس سے الفاظ میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے نہ معانی میں کوئی تغیّر برپا ہوتا ہے۔

ہماری رائے میں یہ لیپا پوتی پروگرام ہے۔ حقائق سے آنکھیں چرانے کی اس سے بہتر مثال اور کہیں سے دستیاب نہیں ہوگی۔ آپ کو جب اقسامِ اختلافِ قرأت دیکھنے کا موقع ملے گا تو آپ ششدر رہ جائیں گے کہ آپ کو اسما کا اختلاف ملے گا۔ ظاہر ہے اس میں افراد، تثنیہ، جمع اور تذکیر و تانیث کا فرق نظر آئے گا۔ اسی طرح افعال کا اختلاف دکھائی دے گا۔ ایک قرأت میں صیغۂ ماضی ہے تو دوسرے میں مضارع۔ اعراب کا واضح فرق مل جائے گا۔ الفاظ کی کمی بیشی کا فرق تو عام ہے۔ کبھی

متبادل ومترادف الفاظ کے کارن معانی ومفہوم میں خاص تبدیلی پیدا نہیں ہوتی اور کبھی مفاہیم ومعانی یکسر بدل جاتے ہیں۔ تقدیم وتاخیر کا فرق بھی موجود ہے۔ لہجے کا فرق تو ''عام سی بات'' ہے۔ حروفِ جارہ وعاطفہ کسی قرأت میں محذوف ہوجاتے ہیں تو کسی قرأت میں باقی دکھائی دیتے ہیں۔ اور ان گھمبیر اختلافی صورتوں کے خود وہ مکرم اصحاب قائل ہیں، جنہیں قرأتوں کا تنوع بیحد ہانٹ کرتا ہے مگر مجبوراً آج وہ ایک قرأت والے قرآن کو قبول کیے ہوئے ہیں۔

یاد آیا ڈاکٹر صبحی صالح نے کہیں یہ بھی لکھا ہے کہ حرفِ سبعہ سے سات قرأتیں مراد نہیں۔ ان کی نظر میں احرفِ اسبعہ اور چیز ہیں، سات قرأتیں مختلف شے ہیں۔ ان کے خیال میں سات قرأتوں کا چرچا دوسری صدی ہجری کی شروعات میں ہوا۔ ڈاکٹر صاحب مزید تائید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ قرأتیں سات نہیں، دس سے چودہ تک ہیں۔ سات قرأتوں اور حروفِ سبعہ میں خطِ امتیاز کھینچتے ہوئے وہ اتنی گہرائی میں چلے گئے ہیں کہ عام ''قاری'' کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ موصوف کہنا کیا چاہتے ہیں اور ثابت کیا کرنا چاہتے ہیں؟

ہم بار دگر عرض کریں گے کہ جس نظریے کی متعیّن تعریف ڈیڑھ ہزار برس میں نہیں ہوسکی، اسے عقیدے کا درجہ دے دینا کہاں کی دانشمندی ہے؟ یعنی ان چودہ پندرہ صدیوں میں یہ تک طے نہیں ہوسکا کہ ''اختلافِ قرأت'' سے مراد کیا ہے؟ طُرفہ تماشا ہے کہ نہیں اس نزاع کو ''کفر اسلام'' کا مسئلہ بنالیا گیا ہے۔ ایسے میں قرآن اور صاحبِ قرآن سے قلبی محبت رکھنے والا اگر یہ کلمہ زبان پر لے آئے قرأتوں کا اختلاف محض شاخسانہ ہے، نرا افسانہ ہے، قرآن پہلے دن سے ایک ہے اور قیامت تک یہ INDEFEASIBLE رہے گا تو اپنے جملہ اختلافات بھلا کر آنِ واحد میں سب اس صادق محب کے پیچھے لٹھ لے کر پڑ جائیں گے کہ ہاں ہاں! تم ہوتے کون ہو ''مسلّمات'' سے انحراف کرنے والے؟

آپ کو یاد ہوگا ہم نے شروعات میں یہ عرض کیا تھا کہ ایک ''قرآن'' اصل قرآن سے باہر ہے۔ یاروں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر دیکھ لیا لیکن اس مزعومہ قرآن کو وہ حقیقی قرآن کے صفحوں میں تادمِ ایں جگہ نہ دے سکے۔ اللہ قرآن کا محافظ ہے۔ یہ حفاظت کیا کسی معجزے سے کم ہے؟ یہ مضمون تشنہ رہے گا، اگر ہم بطور نمونہ چند قرأتی آیات کا یہاں اندارج نہ کریں۔ یقیناً ایسی آیات کتبِ روایات میں اور بھی ہیں جن میں منسوخ وغیر منسوخ سب شامل ہیں۔ اب کس کس ستم کا رونا روئیں؟ یہ لوگ اس حد تک چلے گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ خود ہی مختلف قرأتوں میں اپنی آیات نازل کیا کرتا تھا، پھر حالات وواقعات کے مطابق ان کی قرأتوں کو منسوخ بھی کردیا کرتا تھا اور ہمارے روایت پرست بھائیوں نے اللہ کی منسوخ کردہ قرأتوں کو آج تک سنبھال کر رکھا ہوا ہے کہ کیا عجب کب ان کی ضرورت پڑ جائے یا بالفاظ دیگر:

تا کہ سندر ہے اور وقتِ ضرورت کام آئے

فرق تلاش کریں

قرآنی قرآن	اصل قرآن
(1) وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ وَلَا مُحَدَّثٍ... (بخاری شریف + اُصول الکافی)' (قرأت حضرت ابن عباسؓ)	(1) وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّ لَا نَبِيٍّ... (22:52) (حضرت ابنِ عباسؓ سے منسوب قرأت کو اگر ''صحیح قرآن'' تسلیم کر لیا جائے یعنی متن میں ''محدَّث'' کو بھی شامل سمجھا جائے تو ''اجرائے نبوت'' کے لیے مزید کسی دلیل کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے علامہ غلام احمد پرویز علیہ الرحمہ کی تصنیف ''ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت'')
(2) فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى (قرأت ابنِ عباسؓ)	(2) فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ (4:24) (اگر ''الیٰ اجل مسمّٰی'' کا قرآنی آیت میں اس روایت کے تحت اضافہ کر لیا جائے تو قائلین متعہ کو نا قابل تردید جواز مہیا ہو جائے گا..... اب آپ خود غور کر لیجیے کہ اختلافِ قرأت کا عقیدہ کس درجہ خطرناک ہے۔ اسے ''محض لب ولہجہ'' کا اختلاف قرار دینے والے حد سے زیادہ بھولے ہیں یا پھر ضرورت سے زیادہ شاطر! تاہم حسنِ ظن کا نجیبانہ تقاضا یہی ہے کہ اس سوچ کو سادگی سے ہی تعبیر کیا جائے)۔
(3) وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ	(3) وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ (2:282)
(4) تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ	(4) تَمَّتْ كَلِمٰتُ رَبِّكَ
(5) رَبُّنَا بَاعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا	(5) رَبَّنَا بَاعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا (34:19)
(6) وَامْسَحُوْا بِرُؤُسِكُمْ وَاَرْجُلِكُمْ...	(6) وَامْسَحُوْا بِرُؤُسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ... (5:6) (اس مشہور آیت کا ''قرأتی ورشن'' ہم نے محترم

مولانا محمد انور گنگوہی کی ''مشکلات القرآن'' سے QUOTE کیا ہے۔ موصوف نے ''دفع تعارض'' کے ضمن میں ایک ''مسکت'' جواب یہ بھی ارشاد فرمایا ہے:

''قرأتِ ثانیہ قرأتِ اولیٰ سے منسوخ ہے۔ ابتدا میں مسح رجلین کا حکم تھا۔ پھر یہ حکم منسوخ ہوگیا اور غسلِ رجلین کا حکم دے دیا گیا۔ **ولا تعارض بعد النسخ۔**''

اس جواب کا لاجواب ٹکڑا یہی ہے۔ ''**ولا تعارض بعد النسخ!**'' اور حضرت صاحب نے اپنے اکابر کی تقلید میں اس فارمولے کو رَجھ کے برتا ہے۔ کتنی عجیب بات ہے! قرآن کہتا ہے کہ یہ کلام اگر اللہ کی طرف سے نہ ہوتا تو تم اس کی آیات کو باہم متعارض پاتے۔ اب عملاً ہوا کیا کہ باہم متضاد ومتعارض متعدد آیات نکل آئیں۔ سر پکڑ کر بیٹھ گئے کہ کیا کیا جائے؟ ایک طرف اللہ میاں کا اتنا بڑا دعویٰ، دوسری جانب کھلا کھلا تضاد۔ پھر ان عقلمندوں نے سوچ سوچ کر پائیدار حل یہی ڈھونڈا

''**ولا تعارض بعد النسخ**''

یعنی جو دو آیتیں آپس میں ٹکراتی ہیں ایک کو کینسل کردو۔ اب کوئی کر کے دکھائے اعتراض کہ قرآن میں تضاد ہے؟

اتنا نہ سوچا کہ تضاد کی تعریف ہی یہ ہے کہ دو بیانات آپس میں متصادم ہوں۔ ایک بیان پر کبھی تضاد کا الزام عائد ہو ہی نہیں سکتا۔ جب قرآن کے بیانات آپس میں ملے ہی نہیں تو تضاد کا اعتراض تو اپنے آپ VALID ثابت ہوگیا۔

اب کیا اسے ''دفع'' کرنے کی یہی ترکیب رہ گئی تھی کہ ایک کو ''کاٹا ہوا'' قرار دے کر جان چھڑالی جائے؟ حالانکہ قصہ تو اتنا ہی ہے کہ دو ترجمے آپس میں ٹکراتے تھے نہ کہ آیات۔ اللہ کے بندو! ذرا غور کر کے اپنے تراجم ٹھیک کر لیتے۔ آیات کے مطابق کر لیتے تاکہ اس ''عذرِ گناہ'' کے لمبے چوڑے چکر میں الجھنا ہی نہ پڑتا۔ پر وہ بھی کیا کریں، ''روایات'' مزاحم ہیں۔ خانہ ساز روایات کو چھوڑتے ہیں تو عظیم الشان ادارے ہاتھ سے جاتے ہیں اور کون بے عقل اپنی روزی روٹی اور سیاسی ساکھ پر لات مارتا ہے؟)

(7) فَتَلَقّٰٓی اٰدَمُ مِنۡ رَّبِّہٖ کَلِمٰتٌ

(8) وَالَّذِیۡنَ ہُمۡ لِاَمٰنٰتِہِمۡ

(9) وَیَضِیۡقَ صَدۡرِیۡ

(10) وَانۡظُرۡ اِلَی الۡعِظَامِ کَیۡفَ نُنۡشِزُہَا

(11) کَالصُّوۡفِ الۡمَنۡفُوۡشِ

(12) طَلۡحٍ مَّنۡضُوۡدٍ

(13) فَیُقۡتَلُوۡنَ وَیَقۡتُلُوۡنَ

(14) اَمِ المسیطرون

(15) وَجَآءَتۡ سَکۡرَۃُ الۡحَقِّ بِالۡمَوۡتِ

(16) جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ

(7) فَتَلَقّٰٓی اٰدَمُ مِنۡ رَّبِّہٖ کَلِمٰتٍ (2:37)

(8) وَالَّذِیۡنَ ہُمۡ لِاَمٰنٰتِہِمۡ (23:8)

(9) وَیَضِیۡقُ صَدۡرِیۡ (26:13)

(10) وَانۡظُرۡ اِلَی الۡعِظَامِ کَیۡفَ نُنۡشِزُہَا (2:259)

(11) کَالۡعِہۡنِ الۡمَنۡفُوۡشِ (101:5)

(12) طَلۡحٍ مَّنۡضُوۡدٍ (56:29)

(13) فَیَقۡتُلُوۡنَ وَیُقۡتَلُوۡنَ (9:111)

(14) اَمۡ ہُمُ الۡمُصَیۡطِرُوۡنَ (52:37)

(اگر قرآن میں 'ص' ہے تو پھر یہی صحیح ہے)۔

(15) وَجَآءَتۡ سَکۡرَۃُ الۡمَوۡتِ بِالۡحَقِّ (50:19)

(16) جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ تَحۡتَہَا الۡاَنۡہٰرُ (9:100)

(ڈاکٹر صبحی صالح نے اپنی ''علوم القرآن'' کے صفحہ 159 پر صحیح آیت کے ضمن میں بھی ''جَنّٰتٌ'' لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ قرآن مجید میں ''جَنّٰتٍ'' ہے۔ اسی طرح ''الانہار'' بھی عموماً ''اَلۡاَنۡہٰرُ'' ضبطِ املا میں آیا ہے)۔

(17)وَالذّٰكِرٰتِ وَالْاُنْثٰى	(17)وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى (92:3)
(18)وَكَانَ اَمَامَهُمْ مَلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ صَالِحَةٍ غَصْبًا	(18)وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْباً (18:79)
(19) حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى والصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى صَلٰوةِ الْعَصْرِ	(19) حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى (2:238)
صاحبِ ''علوم القرآن'' نے اس قرأتی آیت کو اسی طرح لکھا ہے ''البرہان'' (جلد اوّل، ص 215) کو مزید توثیق کے لیے دیکھا جاسکتا ہے۔	
(20) وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوَاهُ مُؤْمِنَيْنِ كَافِرًا	(20) وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ (18:80)
(21) وانذر عشير نك الاقربين ورهطك منهم المخلصين	(21) وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (26:214)

دوستو! بطور نمونہ ہم نے اس کالم میں چند آیات کا حوالہ دے دیا ہے۔ واضح رہے قرأتی آیات (جعلی آیات) کی تعداد اتنی ہی نہیں ہے۔ کتبِ اسلاف خیر سے اس خزانے سے بھری ہوئی ہیں۔ اور کچھ نہیں تو ''کتاب المصاحف'' (مرتّبہ ابو بکر عبداللہ بن ابی داؤدؒ) کا ہی مطالعہ کر لیجیے، چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔ مختصر یہ کہ روایات کے عظیم اثاثے سے اگر نیک نیتی سے استفادہ کیا جائے تو موجودہ قرآن کے مقابل ایک متوازی قرآن بسہولت تیار کیا جاسکتا ہے۔[1]

کیا عجب کہ ہمارے ''مومن بھائی'' ٹھیک ہی کہتے ہوں کہ اصل قرآن ستّر (70) گز کا تھا اور اس نسخے میں سترہ ہزار (17000) آیات تھیں۔ یہ الگ بات کہ وہ ''غائب قرآن'' کو ہنوز ''حاضر'' نہیں کر سکے ہیں۔ جس طرح قرأتی قرآن روایات کے شانوں پر سوار صدیوں سے ادھر اُدھر منڈلا رہا ہے لیکن اصل قرآن کے صفحوں میں داخل ہونے کا شرف ابھی اسے حاصل نہیں ہوسکا ہے..... ہم پھر کہیں گے کہ حفاظتِ قرآن کے زندہ معجزے کا دِن رات مشاہدہ کیجیے۔

البتہ ''حیاتِ رسولِ اُمیؐ'' ایسی وقیع تصنیف کے مصنف جناب خالد مسعود نے یہ افسوسناک خبر سنائی ہے:

> ''تیرہ سو برسوں تک کسی نے کسی دوسری قرأت پر قرآن شائع کرنے کی جسارت نہیں کی۔ مسلمانوں کے دورِ انحطاط میں پہلی مرتبہ 1930ء میں مصر میں ورش عن نافع کی قرأت پر قرآن شائع کیا گیا۔ اس کی دیکھا دیکھی سوڈان میں 1978ء میں الدوری عن ابی عمرو اور 1981ء میں تیونس میں قالون عن نافع کی قرأت پر قرآن شائع ہوئے۔ یہ قرأتیں شمالی اور مغربی افریقہ کے بعض حصوں میں رائج ہیں۔ باقی تمام اسلامی دنیا کا قرآن وہی ہے جو ہمارے ہاتھوں میں ہے۔'' (ص 539)

یہ تحقیق کا مسئلہ ہے کہ مذکورہ ''مختلف قرآن'' کے نسخے حاصل کیے جائیں اور پھر تقابل کر کے دیکھا جائے کہ اصل قرآن سے کس قدر فرق ہے؟ نیز اس کے مرتّبین نے کس اساس پر اتنی بڑی جسارت کی ہے؟ باقی قرأت کے باب میں اس نوعیت کی ''جرأت'' کو راقم زیادہ سے زیادہ گستاخی کی ایک کامیاب کوشش قرار دے سکتا ہے۔ آخر خدا کی جانب سے حفاظت کے وعدے کے باوجود کئی بدبخت ایسے بھی گزرے ہیں جو قرآن مجید کے نسخوں کو بری نیت سے جلانے میں ''کامیاب'' رہے ہیں۔ لیکن ایسی ناپاک مساعی سے کیا دنیا سے قرآن اُٹھ گیا؟

آج اگر کوئی اپنی مرضی سے موجودہ قرآن سے ہٹ کر قرآن ترتیب دے لے، تو کیا قرآن کی حفاظت مشکوک ہو جائے گی؟ فرق تو بس اتنا ہی ہے نا کہ کتبِ روایات میں ''قرائتی قرآن'' پہلے سے موجود ہے۔ اگر یہ ان کتابوں میں محفوظ چلا آرہا ہے تو اب زیادہ سے زیادہ یہی ہوا ہے نا کہ اسے کسی ظالم نے اپنے مذموم مقاصد کی خاطر جمع کر کے چھاپ دیا ہے۔ بس!.....ہم پوچھتے ہیں کہ اس کارروائی سے کیا حقیقی قرآن کی وقعت مظنون قرار پا گئی؟

آج اگر کوئی نبوت کا دعویٰ کر ڈالے، حتیٰ کہ اس کا ادعا یہاں تک پہنچ جائے کہ (معاذ اللہ) میں محمد ہوں تو کیا اللہ کے آخری نبی حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی رسالت اور شخصیت (خاکم بدہن) ABOVE BOARD نہیں رہے گی؟ اس دنیا میں جھوٹے مدعیانِ نبوت کی ایک طویل فہرست ہے۔ حتیٰ کہ خدائی کے دعویداروں کا بھی ایسا قحط نہیں ہے۔ اگر کوئی بدباطن ''نیا قرآن'' بھی لے آتا ہے تو کیا اصل قرآن کو اپنی بقا خطرے میں محسوس ہوگی؟

ہم نے جو یہ عرض کیا تھا کہ ''قرائتی قرآن'' اصل قرآن میں شامل داخل نہیں ہوسکا تو اس پس منظر میں ہی کہا تھا کہ وہ ایسا کبھی کر نہیں سکتا۔ یہ ممکن نہیں ہے۔ قرآن کی حفاظت خدا کا ذمہ ہے اور وہ اپنی ذمہ داری سے کبھی غافل نہیں ہوسکتا۔ اور خدا اپنے محافظ ہونے کا حق ایسے جعلی قرآنوں کی موجودگی میں بھی ادا کر سکتا ہے اور کرتا ہے اور قیامت تلک کرتا رہے گا۔

لیکن صاحبو! ہم اُمتِ محمدیہؐ سے منسوب ہوتے ہیں۔ ہماری بھی کوئی ذمہ داری ہے یا نہیں؟ کیا ہماری یہی ذمہ داری ہے کہ ہم خوشبودار کپڑے پہن کر منبر پر کھڑے ہو کر دِن رات یہی تبلیغِ ہدایت کیا کریں کہ قرآن یہ نہیں، اصل قرآن قرائتی قرآن ہے۔ اور قرآن سات/ دس/ چودہ قرأتوں میں نازل ہوا تھا۔ اور پھر اس دعوے کو صادق ثابت کرنے کے لیے دشمنوں کی گھڑی ہوئی روایات کے خزانۂ عامرہ کا منہ کھول دیا کریں، پھر تاریخ کے بے سند ذخیرے کے زور پر اختلاف قرأت کو اُمت کے لیے باعثِ رحمت گردانا کریں؟ یہ تو قرآن سے وفا ہے نہ صاحبِ قرآن (صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم) سے۔

یاد رکھیے! قرآن مجید کا جامع خود خدا ہے۔ اُس نے حرف بحرف ہی نہیں، انہی اعراب کے ساتھ اپنے آخری رسولؐ اور نبی حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے سچے سینے پر اتارا تھا۔ آپؐ قرآن کے حافظ بھی تھے اور محافظ بھی۔ منصبِ رسالت کا اوّلین فریضہ قرآن مجید کی نشر و اشاعت تھا اور آپؐ نے اپنی حیاتِ مبارک میں یہ اس طرح ادا کیا کہ صحابہؓ کی ایک کثیر

جماعت کو قرآن مجید یاد کرا دیا۔ اسی طرح چالیس کے قریب معتبر کاتبوں کے پینل کے ذریعے اس آخری آسمانی صحیفے کا متن کاغذ پر لکھوا دیا۔ جب آپؐ اس دنیا سے تشریف لے گئے تو قرآن نہ صرف کتابی صورت میں جمع ہو چکا تھا بلکہ دور دراز تک اسے پہنچا بھی دیا گیا تھا۔ پھر آپؐ کی پیروی میں خلفائے راشدینؓ نے بھی قرآن مجید کی نشر و اشاعت کا فریضہ بہ دِل و جان ادا کیا۔

پہلا نسخہ جو حضورؐ نے اپنی نگرانی میں تیار کرایا وہ معمولی سے اختلاف کے بغیر من و عن وہی تھا جو آج ہر گھر میں موجود ہے۔ یہی ترتیب، یہی متن، یہی اعراب، یہی نقطے.....سب کچھ یہی تھا۔ قرأتوں کا اختلاف خالص افسانہ ہے۔ سوچی سمجھی سازش ہے۔

دشمنوں نے اس کتاب کی حیثیت کو تشکیک وارتیاب کا مرکز بنانے کے لیے چال چلی کہ یہ سات مختلف متون میں نازل ہوا تھا اور ہم سادہ خاطر ان کے ساتھ ہو لیے۔ رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے خدا سے جس طرح قرآن وصول کیا تھا، اسی طرح یہ امانت اپنی اُمت کے سپرد کر دی۔ آپؐ نے اس کے متن میں ایک حرف کا فرق نہیں آنے دیا۔ آپؐ نے اس کے مفاہیم پر آنچ نہیں آنے دی۔ لیکن ہم وہ بدنصیب ہیں کہ آج تلے ہوئے ہیں یہ ثابت کرنے کے لیے کہ قرآن کے الفاظ محفوظ ہیں نہ اس کے معانی! ہر کسی نے اپنی اپنی تعبیر، اپنی اپنی تفسیر کر رکھی ہے۔ لے دے کے اس کا متن اصلی حالت میں موجود ہے۔ مگر ہم مصر ہیں کہ نہیں جناب! یہ اس طرح نازل ہی نہیں ہوا تھا۔ ہے کسی کے پاس اس ضد کا علاج؟

اس آخری مرحلے میں ایک نہایت سادہ سوال ہم ضرور پوچھیں گے، آخر مختلف قرأتوں کی کیا ضرورت تھی؟ روایت کے مطابق رسولِ کریمؐ نے درمیانی واسطے جناب جبرئیلؑ سے قیل وقال کر کے، اللہ تعالیٰ سے خصوصی اجازت حاصل کی۔ اسی لیے تا کہ اُمت کے لیے آسانیاں پیدا ہو جائیں۔ مفہوم قرآن کا وہی رہے، جو الفاظ جس کو میسر آتے ہیں، پڑھ لیا کرے۔ اس حساب سے پھر قرأت تو ایک ہی ثابت ہوئی۔ ''کہ یہ کتاب ہے، باقی تمام تفسیریں۔'' پر ثقہ صالحین یہاں بھی کب رک سکے؟ انہیں تو اس عقیدے سے تشفی ملی کہ محولہ رعایت کے حصول کے بعد قرآن سات قرأتوں میں ''نازل'' ہوا ہے، جس کو جو SUIT کرتا ہے رکھ لیتا ہے۔

اچھی بات! لیکن کون نہیں جانتا کہ جب قانون کی کتاب کے اتنے متنوع متون ہوں گے تو گھمسان کا وہ رَن پڑے گا کہ الامان! الحفیظ! اور روایات کے مطابق عہدِ عثمانیؓ میں اس نزاع پر تلواریں نیاموں سے نکل آئیں۔ جبھی تو راویوں کے بقول ایک قرأت پر اتفاق کے لیے انہیں باقاعدہ STRATEGY بنانا پڑی۔

کسی قدر عجیب بات ہے کہ امت میں تفرقہ اس وقت ڈالا گیا جب ابھی چند ماننے والے تھے اور جب لاکھوں کروڑوں میں ہو گئے تو پھر فکر پڑ گئی کہ انہیں ایک قرأت پر کیسے متفق کریں؟ یہ تو ایسے ہی ہے کہ لوگوں سے شروعات میں یہ کہہ دیا جائے، میاں! جیسے جی چاہتا ہے نماز پڑھ لیا کرو، وقت کی کوئی قدغن ہے، نہ تعداد کا کوئی تعیّن ہے، رخ کی بھی کوئی پابندی نہیں ہے، امام، مسجد بھی ناگزیر نہیں ہیں، وضو کی بھی کوئی شرط نہیں ہے، پاکی ناپاکی بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے، متن کے سلسلہ میں بھی کوئی

---

❶ علامہ پرویزؒ کی یہ آہ وفغاں 2010ء کی نہیں بلکہ یہ تو 41 سال پیشتر کی ہے۔

حد بندی نہیں ہے۔ جو من میں آئے کرو کہ اصل مطلوب تمہاری آسانیاں ہیں۔ جب من مانیاں عملاً وجود میں آ جائیں، سارا ڈسپلن غارت ہو جائے تو پھر لٹھ پکڑ کر نیل کے ساحل سے لے تا بخاکِ کاشغر انہیں ایک نماز پر متحد کرنے کی مساعی شروع کر دی جائے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ اس اختلافِ قرأت کے قصے کو آپؐ کی عظیم ذات سے منسوب کیا جاتا ہے۔

دراصل ان قائلینِ اختلافِ قرأت نے قرآن مجید کو (معاذ اللہ) جنتر منتر کی کتاب سمجھ لیا کہ مقصد محض ریڈنگ ہے، ثواب ہی لینا ہے۔ تلفظ جو مرضی ہو، الفاظ کچھ بھی ہوا کریں، اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ پھر ثواب بھی کون سا کوئی محسوس اجر ہے۔ ان کے ہاں یہ موصوف اللہ میاں سے بھی بڑھ کر ABSTRACT واقع ہوئے ہیں۔ قرآن خوانی کا ثواب اگلے جہان میں جا کر کچھ ملنے والا ہے۔ لہٰذا انہیں اختلافِ قرأت کے عقیدے سے واقعتاً کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

اب انہیں کون بتائے قرآن اس دنیا کا آخری دستور ہے۔ آسمانی آئین پر مشتمل یہ آخری انعام ہے۔ اس کے بعد قانون کی کوئی کتاب نازل نہیں ہونی۔ اِنسانیت کا یہ آخری سہارا ہے۔ یہ حصولِ ثواب کے لیے اتری ہوئی کوئی ''رتن مالا'' نہیں ہے۔ نہ اس میں جادو کے طریقے درج ہیں۔ یہ ٹونوں ٹوٹکوں کا کوئی مجموعہ نہیں ہے۔ یہ عملیات کا بے معنی دفتر بھی نہیں ہے۔ یہ تعویذات کا خزانہ بھی نہیں ہے۔ یہ فال نکالنے والا کوئی دیوان بھی نہیں ہے۔

یہ تو اِنسان کو اِنسان بنانے والی، بہترین معاشرہ تخلیق کرنے والی، قوانینِ خداوندی کا درک عطا کرنے والی، کائنات کو تسخیر کرنے پر آدم کو آمادہ کرنے والی ایک نہایت خوبصورت رہنما کتاب ہے۔ جس میں کنکریٹ اُصول، ٹھوس حقیقتیں، سرمدی سچائیاں، ابدی صداقتیں غیر مبہم اور دوٹوک انداز میں درج ہیں۔ جن کی صد فی صد درست تعبیر سے ہی سیاسی، سماجی، عسکری، تعلیمی، اخلاقی اور معاشی انقلابات کا منظر نامہ ترتیب پاتا ہے۔ اس لیے اس میں معمولی سی بھی لفظی تحریف صدیوں کو گم کرنے کا سبب بن سکتی ہے۔ لے سانس بھی آہستہ..... نیز یہ کہاں کی اور کیسی آسانیاں ہیں کہ تصور دیا جا رہا ہے کہ جیسے جی میں آئے اسے پڑھ لیا جائے؟ اس تناظر میں اب اور تب کی پھر بحث ہی نہیں رہتی۔ حقیقت یہ ہے کہ تب اس کی اجازت تھی نہ اب اس کے متعلق سوچا جا سکتا ہے۔ یہ ہمارے ایمان کی مضبوط ترین اساس ہے کہ قرآن مجید میں تغیّر ممکن نہیں ہے۔ ختمِ نبوت کے کُل معارف اسی ایک لطیف نکتے میں تو پوشیدہ ہیں۔ اللہ نے خود جو نعمت ہم پر تمام کی ہے وہ یہی تو ہے کہ اس کی نازل فرمودہ آخری کتاب سدا اپنے حقیقی متن کے ساتھ برقرار رہے گی۔ ابتدا سے انتہا تک اس میں کسی بھی تبدیلی کا سرے سے کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ اگر ایک لمحے کے لیے ہی فرض کر لیا جائے کہ قرآنِ مجید وقتِ نزول کسی اور صورت میں تھا تو ساری عمارت آنِ واحد میں زمیں بوس ہو جاتی ہے۔ اگر ایک گھڑی کے لیے یہ تسلیم کر لیا جائے کہ قرآن شریف کی بعض آیات منسوخ ہو چکی ہیں تو اس کے اعتبار کا تقدس پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔ اس سے بڑھ کر ظلم اور کیا ہوگا کہ خیر سے اِنسان یہ تعیّن کریں گے کہ اس کتابِ عظیم کی فلاں فلاں آیت منسوخ ہے۔ نتیجہ سب کے سامنے ہے کہ منسوخ آیات پر اِنسان آج تک متفق نہیں ہو سکے۔ ایک کسی آیت کو منسوخ کہتا ہے تو دوسرا کسی کو۔ کیا کریں بار بار وہی بات کرنا پڑتی ہے اور سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے

کہ قرآن میں خود خدا کہے کہ میں اس کا محافظ ہوں۔ اور روایت یہ کہے کہ آخری دوسورتیں (معوذتین) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے نزدیک قرآن کا حصہ نہیں تھیں۔ انہیں خوفِ خدا ہے نہ رسولؐ کی محبت ان کے دِل میں موجود ہے اور نہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا سچا احترام ہی ان کے ذہن میں ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ حضورؐ کے جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قرآن کے نسخوں میں درج ان سورتوں کو کھرچ دیا کرتے تھے؟

سیدھی طرح یہ کیوں نہیں کہہ دیتے کہ ہمارے نبی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے پیارے ساتھی پر یہ صریح تہمت ہے۔ اگر بالفرض کسی روایت میں ایسی کوئی بات موجود بھی ہے تو ہم اسے دشمنوں کی سازش قرار دیتے ہیں اور اس طرح کی کسی روایت کی ہماری نظر میں پرکاہ سے بھی زیادہ وقعت نہیں ہے۔ ا؎ قرآن ہر شک سے بالا ہے، نبیؐ کی عصمت ہر شبہے سے بلند ہے۔ صحابہؓ کی عظمت ہر طرح سے مسلّمہ ہے۔ ان ابواب میں اگر شکوک کی چیونٹیاں دماغ میں رینگ رہی ہیں تو اپنے ایمان کا نئے سرے سے جائزہ لینا انتہائی ناگزیر ہے۔

انتہائی افسوس کا تو یہ مقام ہے کہ ہمارے لوگ اپنے وجود کے بُت خانے کو برقرار رکھنے کے لیے اس کے اردگرد کعبے ایسی پُرشکوہ عمارت بڑی ہنرمندی سے تعمیر کر لیتے ہیں۔ اور پھر اس پر تاویلات کے تانے بانے سے تیار کیا ہوا سیاہ غلاف بڑے اہتمام سے اوڑھاتے ہیں۔ بعدازاں غیر قرآنی تصورات کو مقدس تحفظ فراہم کرنے کے لیے ''طُرق واسانید'' کے پوتر عنوان سے سفید براق احرام بندھوا کر خانہ ساز راویوں کے جیوش کو ہر دم مصروفِ طواف دکھاتے ہیں۔ ۲؎ یہ خالص چمتکار ہے!

مقامِ تاسّف ہے کہ ہمارے ان لوگوں کو کیا کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ یومِ قیامت بہرطور اپنے ربّ کے حضور حاضر ہونا ہے؟ اور میدانِ حشر میں حضورِ پُرنور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم بھی موجود ہوں گے۔ ان عظیم ہستیوں کا کیسے سامنا کریں گے؟ جب انہوں نے یہ استفسار کیا کہ ہمارے قرآن کو تم لوگوں نے مشتبہ کیوں بنا دیا تھا؟ تو ہمارے یہ محترم کیا وضاحت کریں گے؟ خدارا! ڈریے اس وقت سے کہ آنکھ بند ہوتے ہی قیامت کا عمل شروع ہوجاتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ا؎ قرآن مجید کو مشتبہ قرار دینے میں خانہ ساز روایات نے کس قدر ظالمانہ کردار ادا کیا ہے۔ بطور نمونہ ''اُصولِ کافی'' کی اس روایت کا مطالعہ کافی ہوگا:

(حضرت امام جعفر صادق علیہ الرحمہ نے فرمایا) تم اس قرأت سے باز آجاؤ اور اسی طرح پڑھو جس طرح سب لوگ پڑھتے ہیں تا آنکہ قائم (امام مہدی) ظاہر نہ ہوجائیں۔ جب قائم (بارہویں امام) آجائیں گے تو کتاب اللہ کو اصل قرأت سے پڑھیں گے اور اس مصحف کو حضرت علیؓ نے جبکہ وہ اس کو لکھ کر فارغ ہوئے لوگوں کے سامنے نکال کر پیش کیا تھا اور فرمایا کہ: یہ ہے اللہ کی کتاب جو اس نے محمد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم پر اسی طرح نازل فرمائی تھی۔ اور اسے میں نے دو لوحوں سے لے کر یکجا کیا ہے مگر لوگوں نے کہا کہ ہمارے پاس تو جامع مصحف

موجود ہے جس میں قرآن لکھا ہوا ہے۔ ہمیں (آپ کے) اس مصحف کی کوئی ضرورت نہیں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اچھا تو خدا کی قسم تم اب ابد تک اسے کبھی نہ دیکھو گے! میرا تو یہ فرض تھا کہ جب میں نے اِسے جمع کر لیا تو تمہیں بتا دوں تا کہ تم اسی کو پڑھو۔''

(بحوالہ ''رفقائے نبی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم''، مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی ندویؒ، ص 177-178)

اس روایت کی ایک ایک سطر شہادت دے رہی ہے کہ کسی غیر نے اپنے مذموم مقاصد کی خاطر اسے گھڑا ہے۔ معتبر تر اکابرین اسلام اور اللہ کی کتاب کو مشکوک قرار دینے کی یقیناً یہ عیارانہ مساعی ہے وگرنہ رفیقِ رسولؐ حضرت علیؓ جیسا عظیم جری اور مردِ حق محض چند لوگوں کے DENY کر دینے سے ''حقیقی قرآن'' کو قیامت تک کے لیے غائب نہیں کر سکتا تھا۔

اسی طرح یہ بھی بڑی عجیب بات ہے کہ سیّدنا علی مرتضیٰؓ تو اس ردّعمل میں اس خصوصی مصحف کو ابد تک کے لیے غائب کر ڈالیں اور سیّدنا امام جعفر صادقؒ اس قیمتی نسخے کے بارہویں امام (امام مہدی) کے ظہور کے ساتھ منظرِ عام پر آنے کی بشارت سنا ڈالیں اور پھر اس کی غیوبت نا قابلِ فہم ہے کہ جن صاحب کو امام جعفر صادقؒ روک رہے ہیں وہ غائب قرآن ان کے پاس موجود ہے۔ ایک طرف ابد تک کے لیے غائب، دوسری جانب اس قاری کے قبضے میں موجود۔ اسے کہتے ہیں حیرت کی فراوانی!!!

(تفصیل کے مشتاق مولانا پھلواروی مرحوم کی تحریر کردہ نہایت عمدہ جرح وتعدیل محولہ تصنیف کے اوراق میں ملاحظہ کر سکتے ہیں)۔

۲۔ انتہائی ضروری وضاحت

حضور نبی کریم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی ذاتِ اقدس سے منسوب کسی وضعی سے وضعی اور ضعیف سے ضعیف روایت کو بھی مسترد کرنا ایک سچے مسلمان کے لیے بڑا ہی کڑا امتحان ہے۔ وہ سو بار سوچتا ہے کہیں واقعی یہ فرمانِ رسولؐ ہی نہ ہو۔ یوں عجلت میں وہ اپنے نبیؐ کے ارشاد مبارک کا تارک ہو کر اپنا کُل ایمانی اثاثہ اکارت نہ کر بیٹھے۔ صاحبو! نسبت کوئی معمولی حوالہ نہیں ہے۔ لیکن معروضی حقائق، آپ علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے تقدس اور قرآن مجید میں بیان فرمودہ معیارِ صداقت پر اگر وہ روایت کسی بھی طرح پوری نہ اترتی ہو تو (پھر بھی) جی پر جبر کر کے ہی اسے نا قابلِ قبول قرار دینا پڑتا ہے۔ کیا کیا جائے حبّ نبی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے اپنے تقاضے ہیں۔

اس صراحت کے تناظر میں صحیح احادیث رسول صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی معنویت اور اہمیت اپنے آپ اُبھر آتی ہے کہ آپؐ کے یقینی فرمودات دین کی مسلّمہ اساس ہیں۔ البتہ آپؐ سے جُڑی ہوئی جعلی روایات کو کسی بھی طرح سینے سے نہیں لگایا جا سکتا۔ اور اس سلسلہ میں خود آپؐ نے دوٹوک الفاظ میں اپنی اُمت کی رہنمائی فرما دی ہے:

''میرے بعد تم سے بڑی کثرت سے حدیثیں بیان کی جائیں گی لہٰذا میری کوئی حدیث تم سے روایت کی جائے تو اُسے قرآن کے سامنے پیش کرو پھر جو اُس کے مطابق ہو اُسے قبول کرو اور جو اُس کے خلاف ہو اُسے رَد کر دو۔'' (مسند احمد)

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(گذشتہ سے پیوستہ)

نظریۂ مادیت اِنسان کی جسمانی حیوانی زندگی کا آخری ارتقائی مقام

حیوانی زندگی میں طبعی جسم اور ذہنِ اِنسانی کے متوازی وقوعات سے عِلم کا حصول:

اِنسانی طبعی جسم کا مطالعہ کیا جا چکا ہے، لہٰذا اب ہم عِلم کے حصول کا جسم اور ذہن کے وقوعات میں متوازیت کے تحت سامنے لا رہے ہیں۔ ہم لفظ ''ذہن'' کو اسم کی طرح استعمال کرتے ہیں اور یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہر اسم ذات کے متوافق ایک مادہ شے ہوتی ہے۔ اس نظریہ کو ذہنی مادہ (شے) کا نظریہ کہا جاتا ہے۔ ذہنی مادہ کے نظریہ کے مطابق، انسان دو مختلف مادوں جسم اور ذہن سے متشکل ہے لیکن یہ ذہن ہے جو میری ذات سے قریب تر ہے۔ میرا ایک جسم ہے جس کی حرکات میری پابند ہیں لیکن وہ جو انھیں پابند بناتا ہے وہ جسم نہیں، بلکہ ذہن ہے۔ یہ سچ ہے کہ جس طرح ہم یہ کہتے ہیں کہ ''میرا ایک جسم ہے'' ہم کبھی کبھی یہ بھی کہتے ہیں کہ ''میرا ایک ذہن ہے'' اس نظریہ کے مطابق یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ''میں ایک ذہن ہوں جبکہ یہ کہنا'' کہ ''میں ایک جسم ہوں'' غلط ہوگا۔

یہ بھی سچ ہے کہ جب میں محض طبعی خصوصیات کی بات کرتا ہوں تو میں خود کو جسم کے عین سمجھ سکتا ہوں، لیکن جب میں یہ کہتا ہوں کہ ''میں سوچ رہا ہوں'' تو اشارہ ذہن کی جانب ہے نہ کہ جسم کی طرف کہ جو سوچ نہیں سکتا۔ اِس لیے کہ سوچنے کے لیے جسم (دماغ) کی ضرورت ہے جو فکر کرنے کے لیے شرط لازم ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ جسم میں دماغ خود فکر نہیں کرتا۔ اسی طرح جب میں تسلیم یا یقین کرتا ہوں، حیرت کرتا ہوں۔ خواب دیکھتا ہوں، احساس کرتا ہوں، درد یا لذت محسوس کرتا ہوں تو جسم ان میں کوئی چیز نہیں کرتا بلکہ ذہن کرتا ہے۔ اسی لیے ذہن کو ہی میری اصل ذات کا متبادل کہا جاتا ہے۔ ذہن کو چھوا یا دیکھا نہیں جا سکتا

اور نہ ہی اس کا تصور کرنا ممکن ہے۔ یہ جسم یا دماغ کے اندر نہیں ہوتا یہ غیر مادی ہے اور مکانیت کا حامل نہیں۔

ذہن کی زندگی میں پیش آنے والے وقوعات دماغ کی زندگی کے وقوعات سے علّی طور پر متعلق ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا

یہ مطلب نہیں کہ ذہن دماغ میں ہوتا ہے اور نہ ہی اس کے باہر۔ وہ اپنی غیر مرئی حیثیت رکھتا ہے اور اِس کی پہچان اِس کے اعمال سے ہوتی ہے۔

ہمارے شعور میں ذہنی اعمال کے تین پہلو ہوتے ہیں۔

1۔ وقوف (Cognition)

2۔ احساس (Affection)

3۔ طلب (conation)

اِن سبھی کا ہم مُختصر تعارف کرانے پر اِکتفاء کر رہے ہیں۔

1۔ وقوف: جاننے اور سمجھنے کے ہر عمل کو وقوف کہا جا سکتا ہے۔ اِس میں ہم کوئی عمل دیکھتے وقت محض سمجھتے ہی نہیں، بلکہ اِس کے ساتھ متفق یا غیر متفق بھی ہوتے ہیں۔

2۔ احساس: کسی عمل یا شے سے پیدا شدہ خوشی یا ناخوشی، پسند یا ناپسند کو احساس کہتے ہیں۔

3۔ طلب: طلب ہمارے شعور میں کوشش، جہد اور اظہارِ ہمت کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔

وقوف، احساس اور طلب کو ایک دوسرے میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تینوں پہلو شعور میں اپنی حالت پر قائم اور نا قابلِ تحویل ہوتے ہیں۔ یہ فرض کر لینا بھی ایک غلطی ہے کہ یہ یکے بعد دیگرے پیدا ہوتے ہیں۔ یعنی پہلے ہم جانتے ہیں، پھر محسوس کرتے ہیں اور بعد میں طلب رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر ذہنی تجربہ میں اُن کا ظہور ایک ساتھ اور بیک وقت تینوں حالتوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

یہاں یہ وضاحت کرنا بھی ضروری ہے کہ طبعی وقوعات اور اعمال ہر شخص کے لیے قابلِ مشاہدہ ہیں، لیکن ذہنی وقوع کا مشاہدہ صِرف اُسی ایک شخص کو ہو سکتا ہے، جو اِس کا تجربہ کر رہا ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ منطقی طور پر ممکن ہے کہ ہم ایک دوسرے کا درد کو ایک ہی درد محسوس کر سکیں؟

جواب یہی ہوگا کہ ہمارا ایک دوسرے کا درد محسوس کرنا منطقی طور پر ناممکن ہے۔ مَیں اپنا درد محسوس کرتا ہوں اور آپ اپنا۔ اگر درد کے تجربات دو ہیں تو درد بھی دو ہیں، جنہیں محسوس کیا جا سکے۔

جس طرح جسم میں جسمانی وقوعات رونما ہوتے ہیں، اسی طرح ذہن میں ذہنی وقوعات رونما ہوتے ہیں۔ ہم لفظ ''ذہن'' کو اسم کیطرح استعمال کرتے ہیں۔ ذہنی نظریہ کے مطابق، انسان دو مختلف مادوں جسم اور ذہن سے متشکل ہے لیکن یہ ذہن ہے جو میری ذات سے قریب تر ہے۔

ذہن اور جسم دو ایسے حقائق ہیں جو ایک دوسرے کو متاثر کئے بغیر اور ایک دوسرے سے متاثر ہوئے بغیر متوازی طور پر اپنا وجود رکھتے ہیں۔ جس طرح دو گھڑیاں ایک دوسرے سے آزاد صحیح وقت دیتی ہیں، اسی طرح ذہن و جسم دو حقائق ہیں اور

اللہ نے ان کے درمیان ایسی نسبت رکھی ہے کہ ایک دوسرے سے متوازی عمل کرتے ہیں۔

اِنسانی ذہن شعور کا مرکز ہے۔ مشہور مُفکر اوسپنسکی شعور کو چار سطحوں میں تقسیم کرتا ہے۔

1۔ ابتدائی شعور جو اُس کے نزدیک کیڑوں مکوڑوں کو حاصل ہوتا ہے۔ اِنہیں وہ یک جہتی قرار دیتا ہے۔

2۔ شعورِ سادہ، جو اِس کے نزدیک عام حیوانات کو حاصل ہوتا ہے، جنہیں دو جہتی حیوانی کہا جاتا ہے۔

1۔ شعورِ ذات، جو اِنسان کی خصوصیت ہے، جسے وہ تین جہتی ہستی کہہ کر پکارتا ہے۔

2۔ شعورِ اعلیٰ، جو موجودہ اِنسان سطح سے بلند اگلی ارتقائی منزل ہوگی۔ اُسے وہ چہار جہتی دنیا کا نام دیتا ہے۔

نظریہ شعور کی فہم میں حکمائے مغرب کے ایک ماہر نفسیات سگمنڈ فرائڈ نے انسان کے احساسی اور عقلی کردار کا ملاپ کر کے انسانی شخصیت کو پیش کیا ہے۔ اُس کا مؤقف ہے کہ انسان کے احساسی کردار کے مطالعہ میں لاشعوری ذہنی اعمال کا ذکر کیا گیا ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ ذہنی عمل حافظے سے شعور میں واپس آتا ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ کچھ وقت کے لیے وہ ذہنی عمل ہمارے ''شعور'' میں نہیں تھا۔ تاہم وہ تمام وقت ہمارے ذہن میں تھا۔ ماہرین نفسیات کہتے کہ وہ ذہنی عمل مخفی یا لاشعوری تھا۔ اس پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ لاشعوری خیالات، اور خواہشات کا وجود بطور ذہنی اعمال ممکن ہی نہیں کیونکہ ہر ذہنی عمل لازمی طور پر شعوری ہوتا ہے۔

فرائیڈ کا اِنسانی ذات کے شعور میں مخفی قوتوں کی شمولیت کی دریافت:

کبھی یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ ایک لاشعوری مخفی خیال کمزور ہونے کی وجہ سے مخفی ہوتا ہے اور جب وہ طاقت حاصل کر لیتا ہے تو شعوری بن جاتا ہے۔ لیکن اب یہ تسلیم کرنے کے لیے ہمارے پاس کافی جواز ہے کہ بعض مخفی خیالات خواہ وہ کتنے ہی طاقتور کیوں نہ ہوں شعور میں داخل نہیں ہو سکتے۔ یہ مخفی خیالات درجِ ذیل دو قسم کے ہوتے ہیں:

1۔ وہ خیالات جو طاقت ور ہونے پر شعور میں داخل ہو سکتے ہیں۔ ان کو فرائیڈ تحت الشعوری کہتا ہے۔

2۔ وہ خیالات جو اپنی طاقت اور شدت کے باوجود شعوری نہیں بن سکتے۔ انھیں فرائیڈ لاشعوری کہتا ہے۔

فرائیڈ کے نظریہ کے مطابق انسانی شخصیت کی ساخت میں تین طرح کے عناصر (قوتیں) شامل ہیں۔

1۔ اڈ (Id)/ لاذات

2۔ ایغو (Ego)/ اَنا اور

3۔ سپر ایغو (Super Ego)/ فوق الاَنا۔

یہاں ہم اِن تینوں قوتوں کا مُختصر سا تعارف کرا رہے ہیں۔

1۔ اڈ/ لاذات شخصیت بے پناہ حیوانی قوت پر مبنی لاشعوری تقاضوں پر مشتمل ہے۔ لاشعور میں ہونے کی وجہ سے انسان عام طور پر ایسی خواہشات سے باخبر نہیں ہوتا۔ یہ اِنسانی ذہن کے بیشتر حصہ پر محیط ہوتی ہیں۔ ان کا تعلق اِنسانی

احساست سے وابستہ ہوتا ہے اور عمومی طور پر یہ لذّت والم کے قانون کے تابع ہوتی ہیں۔ اِس کی دوسری صفت یہ ہے کہ یہ اپنے مطالبات فوری طور پر منوانا چاہتی ہے۔

2۔ ایغو۔ اَنا۔ انسان کی حیوانی ذات کی یہ حیوانی قوت اڈ کو حقیقت کا پابند رکھنے کے لیے ''ایغو'' یا ''انا'' کی نشوونما کرتی ہیں۔ اس کا بنیادی وظیفہ عقلی ہے اور وہ یہ ہے کہ اڈ کے مطالبات صرف معقولیت کی حد تک تسلیم کیے جائیں۔ ایغو، اڈ کو حد سے تجاوز نہیں کرنے دیتا۔ اس کی سوچ کا انداز منطقی اور حقیقت پسندانہ ہوتا ہے۔

3۔ سُپر ایغو۔ اِس کا اڈ کی بے لگام خواہشات اور مطالبات سے نپٹنے کے لیے ظہور ہوتا ہے۔ یہ قوت دراصل انسانی ضمیر کہلاتی ہے اور اس کے فرائض یہ ہیں:

1۔ اڈ کی خواہشات پر پابندی عائد کرنا بالخصوص ایسی خواہشات جن کی، علانیہ تکمیل کا معاشرہ اجازت نہیں دیتا۔

2۔ ایغو کو اخلاقی مقاصد ملحوظ رکھنے پر آمادہ کرنا۔

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ اڈ، ایغو اور سپر ایغو شخصیت کی ساخت نہیں جن کا وجود ہمارے اندر کہیں نہ کہیں موجود ہے، اس کے برعکس یہ شخصیت کی تین مختلف طاقتیں ہیں اور تینوں کے باہمی تعلقات انسانی کردار کی تشکیل میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

انا کو۔ جو شعوری اور مہذّب ہوتی ہے متصادم مطالبوں اور تقاضوں کے مابین ثالث کی حیثیت سے مصالحت کرانا ہوتی ہے۔ اسے ایک تو داخلی کے علاوہ خارجی حقیقت کو ملحوظِ نگاہ رکھتے ہوئے اِس سے تطابق پیدا کرنا پڑتا ہے۔ دوسرے اِسے ذات کی بھی کچھ نہ کچھ تسکین مہیا کرتے ہوئے فوق الانا کو بھی مطمئن کرنا پڑتا ہے۔ لا ذات کے اُکسانے، فوق الانا کے دھمکانے اور سُپر ایغو کے ڈرانے کی وجہ سے انا ہمیشہ شدید آزمائش میں رہتی ہے۔

فرائیڈ کے نظریے کا خلاصہ یوں ہے کہ ہمیں حیوانی قوت پر مشتمل لاشعوری ذہنی اعمال کے وجود کو بجا طور پر تسلیم کرنا ہو گا۔ لاشعور کی بے لگام خواہشات سے نپٹ کر اِسے حقیقت کا پابند کرنے کے لیے ایغو (انا) کی نشوونما کرنا ہوتی ہے۔ ہمارا ان تینوں قوتوں کو شخصیت کی ساخت خیال کرنا درست نہیں بلکہ یہ اس کے تین تصورات ہیں جو شخصیت کی حقیقت سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ کردار کی تشکیل میں ان تینوں قوتوں کے باہم میں تصادم ہوتا رہتا ہے۔ ان میں سے کسی ایک قوت کے طاقتور یا ضعیف ہونے سے خاص قسم کی شخصیت ظہور میں آتی ہے۔ اِن میں تصادم اگر خطرناک صورت اختیار کر جائے تو ایغو کی مدافعتی میکانیاتی شکلوں میں سے انتخاب کر کے مداوا کیا جاتا ہے اور شخصیت مزید تصادم سے بچ جاتی ہے۔

سگمنڈ فرائیڈ نے انسان کے احساس پر مبنی ذہنی کردار کا ملاپ کر کے انسانی شخصیت کو پیش کیا ہے۔ اُس کا مؤقف ہے کہ انسان کے احساسی کردار کے مطالعہ میں لاشعوری ذہنی اعمال کا ذکر کیا گیا ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ ذہنی عمل حافظے سے شعور میں واپس آتا ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ کچھ وقت کے لیے وہ ذہنی عمل ہمارے ''شعور'' میں نہیں تھا تاہم وہ تمام وقت

ہمارے ''ذہن'' میں تھا۔ لہٰذا اِس کی مکمل فہم رکھنا ضروری ہوجاتا ہے۔

ذہنی کردار پر بات کرنے کے بعد آپ ہم اِنسان کا بطور عاقل حیوان کے جذباتی کردار پر روشنی ڈال رہے ہیں۔

عقل سے غور و فکر کر کے حیوانی جِبلتوں پر اِنسانی فعال جذبات کا غلبہ:

جذبات کی اصطلاح سے ان تاثرات و ہیجانات کی تنظیم کا مفہوم لیا جاتا ہے جو کسی شے یا تصور سے وابستہ ہوتی ہے۔

جبلتیں حیوان اور جذبات اِنسان کی خاصیت ہیں اور انسان کی حیوان سے تمیز کرنے کے لیے جذبات کو سپائی نوزا منفعل اور فعال میں تقسیم کر کے، انسانی رویہ کی وضاحت کرتا ہے۔

1۔ منفعل جذبات وہ ہیں جن کی علتوں کا ہم فہم نہیں رکھتے، بلکہ ہم پر مسلط ہوجاتے ہیں۔ اِنسانی شخصیت کی تعمیر کے لیے یہ غیر معتدل اور ناموزوں شمار ہوتے ہیں۔ جذبات کی یہ قسم انسان کو حیوانی زندگی گزارنے کی دعوت دیتی ہے۔ یہ حُب نفسی پر مشتمل ہوتی ہے، جو شہوت یا اشتہائے نفس اور صرف ہماری خواہشات کے تحفظ کا احساس رکھتی ہے اور اس کا دوسروں کے لیے ایثار کرنے کا خیال ہی محال ہے۔

2۔ فعال جذبات جو منفعل جذبات کے برعکس ہمارے اپنے علم اور شعور سے حاصل ہوتے ہیں اور یہ انسان کو حیوانوں سے ممتاز کر دیتے ہیں۔ یہ عقل فیض رسانی کی سخاوت سے تعلق رکھتے ہیں اور انسانوں کو غلامی سے نکال کر آزادی عطا کرتے ہیں۔

جذبات کا معرضِ وجود تب ہوتا ہے جب حیوان کی جِبلتوں پر اِنسانی عقل سے قابو پایا جاتا ہے۔ اِس لیے کہ اِنسانی ذہن سے کوئی جذبہ ہی دوسرے جذبے کو نکال سکتا ہے۔ چنانچہ منفعل جذبات کو شکست دینے اور مار بھگانے کے لیے اِنسان کے اپنے فعال جذبات ہی کارآمد ہوسکتے ہیں۔ اِسی کے تسلسل میں فعال جذبات میں حُبِ نفسی کو عقلِ فیض رسانی میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ اِسی لیے افراد اور معاشروں کی سیرت اور کردار کے سلسلے میں جذبات کی نشوونما بہت اہمیت رکھتی ہے۔

علمِ نفسیات میں میکڈوگل نے جذبات کی درج ذیل تعریف کی ہے، جسے بہت اہمیت حاصل ہے۔

جذبات اساسی اور کرداری زندگی کی تنظیم کا باعث قرار پاتے ہیں۔ جذبات کے بغیر ہماری یہ ہیجانی زندگی افراتفری کی زندگی ہوگی۔ یعنی ہماری زندگی تنظیم توافق اور تسلسل کے بغیر ہوگی اور ہمارے تمام معاشرتی روابط اور کردار ہیجانات اور ان کی انگیختوں پر مبنی ہونے کی وجہ سے درہم برہم، ناقابل پیشین گوئی اور غیر متوازن ہوں گے۔ جذبات میں ہیجانی میلانات کی باقاعدہ تنظیم ہی کی وجہ سے ہیجانات کی فوری اشتعال انگیزیوں کا ارادی انضباط ممکن ہوتا ہے۔ علاوہ بریں خوبیوں اور قدروں سے متعلق ہمارے فیصلوں کی بنیاد ہمارے جذبات ہی ہوتے ہیں۔ اور وہی ہمارے اخلاقی اصولوں کے سرچشمے ہوتے ہین، کیونکہ ہمارے ان فیصلوں سے تشکیل پذیر ہوتے ہیں جن کا تعلق اخلاقی قدروں سے ہوتا ہے۔

(جاری ہے)

محمد انوار خان، اسلام آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ تک رسائی بذریعہ قرآن اور اسوۂ حسنہ

ہمارے معاشرے میں برس ہا برس سے ایک مجوزہ طریقہ کار رائج ہے جس کے تحت وطن عزیز کی افسر شاہی سے ہم اور آپ فوری طور پر ملاقات کا شرف حاصل نہیں کر سکتے۔ تاوقتیکہ ان کے پی اے صاحب کے توسط سے پیشگی وقت حاصل نا کرلیا جائے۔ البتہ پی اے صاحب کو بھی یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی چھوٹے آفیسر سے آپ کا رابطہ کرادے اور چھوٹا آفیسر مزید چھوٹے آفیسر سے آپ کی بات کرادے۔ لہذا یہ لامتناہی سلسلہ کہاں جا کے رکے کوئی بھی قبل از وقت بتانے سے قاصر ہے۔ یہ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ جتنا بڑا آفیسر ہوگا اتنا ہی بڑا اس کا پروٹوکول بھی ہوگا اگر بڑے صاحب کو ناگوار خاطر نہ گذرے اور ان کے اپنے آفیسر سے پہلے ہی کوئی ملاقات طے شدہ نہ ہو تو شاید شرف ملاقات نصیب ہو جائے بصورت دیگر آپ کو طویل انتظار کی زحمت اٹھانا ہوگی۔ بالفرض محال ملاقات ہو بھی گئی تو اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں کہ بنا وصولی نذرانہ یا بہت بڑی سفارش آپ کا مدعا قابل سماعت بھی ہو۔

چنانچہ یہی کلیہ ہمارے کچھ علماء کرام اللہ تبارک وتعالیٰ سے ملاقات کا بھی بیان کرتے ہیں۔ یعنی اگر آپ اللہ ربّ العزت کی قربت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو پہلے مندرجہ ذیل مراحل کو طے کرنا ہوگا بصورت دیگر یہ ملاقات ممکن نہ ہوگی۔

1۔ ابتدائی طور پر کسی قریبی مسجد کے مولوی صاحب سے روابط استوار کرنے ہونگے۔

2۔ ان کا شاگرد بننا پڑے گا ان کے مسلک اور فقہ پر کاربند ہونا پڑے گا۔

3۔ پھر کسی مزید بڑے مذہبی عالم کی چوکھٹ کھٹکھٹانی پڑے گی جن کا تعلق بھی ان ہی نظریات سے ہو بصورت دیگر ایک نئے سرے سے تعلیمات کا آغاز کرنا ہوگا۔

4۔ پھر کسی قطب ابدال کے پاس جانا ہوگا۔

5۔ کسی پیر فقیر سے ملنا پڑے گا۔

6۔ کسی ملنگ کے ناز نخرے اٹھانا پڑیں گے۔

7۔ چلاکشی کرنی پڑے گی دن اور رات کے وظائف کا ورد کرنا پڑے گا۔

8۔ اپنی ہستی کو فنا کرنا پڑے گا تب کہیں جا کے قرب الٰہی نصیب ہوگا۔ بے شک اس تگ وتاز میں آپ خود ہی فنا ہو جائیں۔

البتہ اس ساری جہد مسلسل میں آپ کو کہیں بھی ایسے شخص سے ملنے کو نہیں کہا جائیگا جو صرف قرآن حکیم اور اسوہ حسنیٰ کی تعلیم دے اور وحی الٰہی کی عظمت بیان کرے۔ اور اگر بالفرض محال قرآن پاک کا لفظ سنائی دے بھی گیا تو فقط اتنا کہ چند مخصوص آیات کا ورد بنا سمجھے ادا کرتے چلے جائیں اور لامحدود ثواب کے حقدار بنتے چلے جائیں بے شک آپ سے سرزد

ہونے والے گناہ سمندر کے جھاگ سے بھی زیادہ کیوں نا ہوں۔ اتنی عظیم الشان گواہی کے بعد کون ہوگا جو الم سے والناس تک قرآن کریم کو سمجھ کر پڑھے گا اور احکام الٰہی پر عمل پیرا ہوگا۔ مزید برآں آپ اپنی دیرینہ خواہشات اور حاجات کو پورا کرنے کے لیے وظیفہ لکھی کا ختم شریف کرائیں یا تینتیس چونتیس، گیارہ یا سات یا کم از کم تین مرتبہ کچھ قرآنی کلمات پڑھ لیں آپ کی دنیاوی اور اخروی تمام خواہشات کا ازالہ ممکن ہوجائے گا۔ دراصل ہم مسلمان مِن حَیثُ القَوم اسوہ حسنہ کی تلاش میں نا جانے کہاں کہاں سرگرداں و پریشاں گھومتے پھرتے ہیں۔ جانے انجانے میں کس کس چوکھٹ پر اپنی پیشانی ٹیکتے ہیں، جبکہ علامہ اقبال نے دو اشعار میں ہمیں اس حقیقت سے روشناس کرادیا تھا کہ:

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہر ہر عمل اور پیغام وحی الٰہی کا تابع تھا۔ اور وحی الٰہی کی عظمت اس بات کی گواہ ہے کہ وہ کبھی بھی انسانی مفادات سے متصادم نہیں ہوسکتی وحی الٰہی میں تا قیامت انسانی معاشرے کے لیے بھلائی ہی بھلائی مضمر ہے۔ مگر ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت امت کو بانٹنے کا پلان بنایا گیا اور دیدہ دانستہ اللہ اور رسول تک رسائی کے وہ وہ شارٹ کٹ بتائے اور سمجھائے گئے کہ اللہ کی پناہ۔ لہذا گمراہ کن نتائج کی ناختم ہونے والی فہرست ہمارے سامنے ہے فرقہ واریت کا ایک عظیم طوفان ہے جو سنبھلنے کا نام ہی نہیں لیتا بلکہ اس میں روز افزوں اضافہ ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

اس کے برعکس ارشاد خداوندی ہے۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (سورۃ ق: آیت 16) (یہ سمجھتے ہیں کہ انسان جو کچھ چوری چھپے کرتا ہے اس کا ہمیں علم نہیں ہوسکتا اس لئے ایسے اعمال کا مواخذہ کس طرح ہوسکتا ہے؟ ان کا یہ خیال بھی غلط ہے)۔ ہم انسان کے خالق ہیں (اور ظاہر ہے کہ خالق سے اپنی مخلوق کی کوئی بات پوشیدہ نہیں ہوتی۔ لہٰذا اس کے ظاہری اعمال تو ایک طرف) ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اس کے دل کی گہرائیوں میں کیا کیا خیالات اور وساوس گذرتے ہیں۔ (پھر یہ بھی نہیں کہ خالق، اپنی مخلوق سے کہیں الگ ہو کر بیٹھ گیا ہو) ہم انسان سے اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ (اس لئے ہم سے اس کا کیا چھپا رہ سکتا ہے)۔

قرآن حکیم کے اتنے واضح حکم کے بعد کیا اس بات کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ ہم وحی الٰہی اور اسوہ حسنہ کو چھوڑ کر در بدر کی ٹھوکریں کھاتے پھریں۔ موجودہ دور کی سائنس اور ٹیکنالوجی نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ کسی بھی مشینری کو بنانے اور چلانے سے پہلے اس کا ایک مینول تیار کرلیا جاتا ہے تاکہ آنے والے دنوں میں اگر مشین میں کوئی نقص واضح ہو یا اس میں مزید بہتری لانا ہو تو اس کو مینول کی مدد سے فوری طور پر سمجھا اور درست کیا جاسکتا ہے۔ بالکل اسی طرح خدائے واحد و لاشریک نے انسانوں کو دنیا میں بہترین زندگی بسر کرنے کے لیے اپنے پیغمبروں کے ذریعے وحی الٰہی کا نزول فرمایا تاکہ تا قیامت انسان اپنی موجودہ اور آنے والی زندگیوں کو خوشگوار انداز سے بسر کرسکیں۔

اللہ رب العزت کے قوانین اٹل اور غیر متبدل ہیں وہ کسی خاص فرد یا قوم کے لئے مخصوص نہیں بلکہ جو فرد اور قوم ان احکامات پر عمل پیرا ہوگی دنیا میں عزت و تکریم سے سرفراز ہوگی۔ ہم جس کرہ ارض کے باسی ہیں یہاں قانون مکافات کارفرما ہے۔ مثال کے طور پر آم کی گٹھلی سے آم ہی نکلے گا گندم کے دانے سے گندم ہی نکلے گی جو کا دانہ نہیں نکل سکتا۔ بالکل اسی طرح ہر انسان اپنے

اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔ یقیناً اچھے اعمال کا صلہ اچھا ہوگا اور برے اعمال کے نتائج برے ہی ثابت ہونگے۔ البتہ اجتماعی برائیوں کی لپیٹ میں اچھے افراد بھی آسکتے ہیں۔ لہٰذا ہمارا نصب العین اجتماعی بہتری کے لیے ہونا چاہیے کیوں کہ اگر معاشرہ اجتماعی بہتری کی جانب گامزن ہوگا تو چند برے لوگ بھی بہتری کی راہ پر چلنے پر مجبور ہوجائینگے جبکہ اجتماعی برائی چند اچھے افراد کو برائی سے بچا نہ سکے گی۔ لہٰذا جب ہم اپنے گردوپیش میں بسنے والے دیگر ممالک کی جانب دیکھتے ہیں تو صورت حال بڑی مختلف نظر آتی ہے۔ فی الوقت ہمارا مطمعِ نظر کسی یورپی امریکی یا ایشیائی ملک کے ساتھ اپنا موازنہ پیش کرنا مقصود نہیں، بلاشبہ یورپ اور امریکہ کے معاشرے میں اخلاقی پستی اپنے عروج پر ہے جس میں زیادہ تر انفرادی نوعیت کے مسائل شامل ہیں۔ شاید اسی وجہ سے ان کا اجتماعی معاشرہ بڑی حد تک بڑی خرابیوں کا باعث نہ بن سکا۔ ان کے ہاں قانون کی حکمرانی ہے اور جزاء وسزا کا دہرا معیار نہیں ہے۔ بلاشبہ یہی اسلامی فلاحی ریاست کا بھی تصور ہے۔ مگر بڑے دکھ کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ جب بھی بات ہو کرپشن سے پاک معاشرے کی تو سرفہرست نام یورپ کے چند ممالک کا ہی آتا ہے۔ البتہ اس کارخیر میں برصغیر کی مسلمان ریاستوں کا دور دور تک کوئی ذکر نہیں ملتا۔ ان ہی اقوام میں جاپانی قوم بھی ہے جو اپنے رہن سہن اور ایک دوسرے کے ساتھ عزت وتکریم کے ناطے جانی مانی جاتی ہے۔ یورپین اقوام کے پاس جو آسمانی صحیفے موجود ہیں ان میں ردوبدل پایا جاتا ہے جس کے باعث وہ اقوام حقیقی پیغام الٰہی سے محروم ہیں۔ جبکہ جاپانی قوم کے پاس سرے سے ان کی اصلاح کے لیے کوئی صحیفہ موجود ہی نہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے خدائے بزرگ وبرتر کے عالمگیر قوانین پر عمل پیرا ہوکر دنیا کی سچی ترین قوم ہونے کا اعزاز حاصل کرلیا ہے۔ ان ممالک میں قانون کی حکمرانی ہے لہٰذا جس معاشرے میں چھوٹے بڑے کے لیے ایک قانون ہو وہاں انسانیت پھلتی پھولتی نظر آتی ہے۔

اس کی نسبت ہم مسلمان اور بالخصوص پاکستانی مسلمان جن میں تمام معاشرتی برائیاں بدرجہ اتم موجود ہیں نا جانے کس خام خیالی میں مبتلا ہیں اور نا جانے کس مسیحا کی آمد کے منتظر ہیں جو آکے ہمارے سارے انفرادی اور اجتماعی مسائل اور بد اعمالیوں کو آن واحد میں درست کردے گا۔ یہ جانتے بوجھتے ہوئے کہ ھدایت کا سرچشمہ جس کے ایک ایک حرف کی حفاظت کی ضمانت خدا واحد نے خود تا قیامت تک اپنے ذمہ لی ہوئی ہے وہ ہمارے ہر گھرانے میں ایک سے زیادہ تعداد میں موجود ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ہمارا اس بات پر بھی کامل یقین بھی ہے کہ جو ھدایات خدا واحد کی جانب سے آنا تھیں وہ آچکیں نبوت اور وحی الٰہی کا سلسلہ ختم ہو چکا۔ چنانچہ اب قرآن حکیم تا قیامت ہماری اصلاح اور رہنمائی کے لیے نا صرف موجود ہے بلکہ پچھلے 1444 سالوں سے ہماری راہ تک رہا ہے کہ کل تک جو امت قرآنی احکامات پر عمل پیرا ہوکر آسمانوں کی بلندیوں پر براجمان تھی آج گمراہی کی دلدل میں کیوں دھنسی ہوئی ہے۔ مگر اس سے بھی کہیں زیادہ تکلیف دہ اور دل گرفتہ بات یہ ہے کہ ہمیں اپنی اس ذلت اور رسوائی کا سرے سے احساس تک نہیں۔

اپنی بات کا اختتام علامہ کے چند اشعار پر کرتا ہوں۔

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے — وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج — یہ سب باقی ہے تو باقی نہیں ہے

The Human Self and Allah

Episode No. 18

By G. A. Parwez
(Translated by: Dr. Ejaz Rasool)

8.7 Books of Revelation are *Rehmat* for Mankind

The aim of messenger-hood and the messenger is to convey the guidance of Allah to the people, and this guidance used to be communicated through these books which used to be revealed to these *Anbiya* (messengers of Allah). Hence, these DivineBooks are a *Rehmat* for humanity. EarlierBooks were *Rehmat* in their own respective eras. Then, when these were tampered with, that same *Rehmat* was preserved in the Quran in its complete form. Now this very Book is a *Rehmat* of Allah for all mankind and for all times. About the Torah, from among the earlierBooks, the Quran states:

And before this (the Quran), was the Book of Moses as a guide and Rehmat… (46:12)
See also (6:154, 7:154, 11:17, 28:43)

8.8 The Quran is *Rehmat*

And now the Quran is a *Rehmat*:

And this is a Book which We have revealed as a blessing: so follow it and be righteous, that you may receive Rehmat. (6:155)

There is guidance in it, hence this is *Rehmat* (12:111). It is such a *Rehmat* which removes those differences which former Ummahshad devisedin relation to their religions (27:77-78). Not only is it a remover of differences of previous Ummahs, but the Book which eradicates all differences, and this is the evidence for its being a guidance and a *Rehmat*:

And We sent down the Book to you for the express purpose, that you should make clear to them those things in which they differ, and that it should be a guide and Rehmat to those who have Eimaan. (16:64)

Not only for matters in which there are differences but a *Rehmat* which makes every matter clear:

…and We have sent down to you the Book explaining all things, a Guide, a Rehmat, and Glad Tidings to Muslims. (16:89)

The details in it and the manifestation of these is according to the knowledge of Allah, hence there is no possibility of any error anywhere in it - this is also evidence for its being a *Rehmat*:

For We had certainly sent unto them a Book, based on knowledge, which We explained in detail, a guide and Rehmat to all who have Eimaan. (7:52) See also (10:82, 29:51, 31:2-3)

When this Book is such a *Rehmat*then however much mankind celebrateswith joy at this gift of *Rehmat*, it is not enough:

O mankind! there has come to you a direction from your Rabb and a healing for your hearts, and for those who have Eimaan, a guidance and Rehmat. Say: 'In the bounty of Allah. And in His Rehmat, in that let them rejoice': that is better than all that they hoard. (10:57-58)

Butas has been noted earlier, in order to benefit from this *Rehmat* it is essential to make ourselves willing to accept its effect.Hence, it is stated about the Quran that though it has guidance and warning for the whole of mankind, it will only becomea *Rehmat* for those who will maintainconviction in its truths:

These are clear evidences to men and a Guidance and Rehmat to those who have Eimaan. (45:20) See also (7:203-204)

Whoever becomesassociated with this source of guidance, Allah will bless him with His *Rehmats*:

O mankind! verily there has come to you a convincing proof from your Rabb: For We have sent unto you a light (that is) manifest. Then those who have Eimaan in Allah, and hold fast to Him, soon will He admit them to Rehmat and Grace from Himself and guide them to Himself by a straight way. (4:174-175)

8.9 *Siraat-e-Mustaqeem* is *Rehmat*

Examine closely the latter part of the above quoted verse in which it is stated that finding a straight and balanced path in the journey of life is a *Rehmat* of Allah. The forces of *Iblees* are always busily engaged in these efforts that man, leaving this path, should adopt other ways. Remaining protected from these evil efforts is also a *Rehmat*of Allah. Hence, it is noted about Rasul-ullah himself:

But for the Grace of Allah to you and His Rehmat, a party of them would certainly have

plotted to lead you astray…(4:113)

Aside from external influences, remaining protected from the hedonism fuelled whisperings of one's own heart, is also a *Rehmat* of Allah. In the narrative of Yusuf, the wife of the Aziz stated:

'Nor do I absolve my own self (of blame): the (human) self is certainly prone to evil, unless my Rabb do bestow His Rehmat: but surely my Rabb is Protecting, Raheem.' (12:53)See also (4:83)

This fact should once again be brought to mind that when it is said that one cannot be protected from these whisperings etc. without Allah's *Rehmat*, this does not mean that for this purpose man himself cannot do anything, that this occursonly through Allah's 'mercy and compassion'. This concept is against the teaching of the Quran. When it is stated that thiscan only happen throughAllah's *Rehmat*, it means that it can only happen in that situation when man follows Allah's *Wahi*, because(as we have seen earlier) themeaning of Divine *Rehmat* is Divine *Wahi*which is now preserved in the Quran. Hence, the only way to remain protected from the intrigues of *Iblees* and the whisperings of the heart is that man should obey the Quran and make use of his emotions under its guidance.

8.10 Leniences in *Shariat* are *Rehmat*

To receive such leniences in *Shariat*due to which it becomes possible to implement the laws is a *Rehmat* of Allah. For example, in relation to the *Law of Qisas*, the recompense for murder is murder, but together with thisit is stated:

…But if any remission is made by the brother of the slain, then grant any reasonable demand, and compensate him with handsome gratitude, this is a concession and Rehmat from your Rabb…(2:178) See also (24:10)

But this concession and *Rehmat* can only be received viathe law of Allah, not as a resultofthe personal sentiment of sympathy of some individual. The implementation ofthe Divine laws is the responsibility of the Islamic system,and personal sentiments of sympathy should never intervene in their implementation. For example:

The woman and the man guilty of adultery or fornication, flog each of them with a hundred stripes: Let not compassion move you in their case, in a matter prescribed by Allah, if you have Eimaan in Allah and the Hereafter Day…(24:2)

8.11 The Law of Requital is a *Rehmat*

This is because it is the Law of Requital itself on which the foundation of the system of the universe is based and this is also a *Rehmat* of Allah:

If they accuse you of falsehood, say: 'Your Rabb is full of Rehmat all-embracing, but from criminal people never will His wrath be turned back'. (6:147)

This is because if there is no recompense for evil deeds, then people will continue toexceed in their rebellion, and life on earth will become intolerable for those who aredecent:

If We had Rehmat on them and removed the distress which is on them, they would obstinately persist in their transgression, wandering in distraction to and fro. (23:75)

The Law of Requital is not confined to individuals only, the rise and fall of nations also occurs according to it:

To all are degrees (or ranks) according to their deeds: for your Rabb is not unmindful of anything that they do. Your Rabb is self-sufficient, full of Rehmat: if it were His will, He could destroy you (as per His law), and in your place appoint whom He will as your successors, even as He raised you up from the posterity of other people. (6:132-133)

8.12 Period of Respite is also a *Rehmat*

An intervalhas been kept between the commission of a deed and the manifestation of its result so that those who commit an error in ignorance canmake amends during this time, and this is called the period of respite and is Divine *Rehmat*:

But your Rabb is Most protecting, full of Rehmat. If He were to call them (at once) to account for what they have earned, then surely, He would have hastened their punishment: but they have their appointed time, beyond which they will find no refuge. (18:58)

If an individual or nation realises that it has taken a step in the wrong direction, then it is necessary for it to immediately turn around and return to the point from where the step in the wrong direction was taken, following which it should step in the right direction. Turning back from the wrong path is called *Taba* and stepping in the right direction after this is called *Aslaha*. By doing this an individual becomesprotected from the harmful effects which were incurred as a result of going in the wrong direction, this is called *Maghfirat*. Keeping the provision of these matterswithin the 'Law of Requital' is Allah's

Rehmat.

8.13 Acceptance of *Tauba* is also a *Rehmat*

The Quran states:

> Say: 'O my Servants who have transgressed against their selfs! Despair not of the Rehmat of Allah: for Allah provides protection (as per His law) from all ill effects: for He is Protecting, Raheem. (39:53)

Provided this errorhas occurredinadvertently,and is not deliberateand due to arrogance, and after this amends have also been made:

> When those come to you who have Eimaan in Our signs, Say: 'Peace be on you: Your Rabb has inscribed for Himself Rehmat: verily, if any of you did evil in ignorance, and thereafter repented, and amend (his conduct), lo! He is Protecting (from ill effects as per law), Raheem. (6:54)

But if after this man again adopts rebellion, then he will have to suffer the consequences for this i.e. a one-off repentance cannot be a permanent permit of protection:

> It may be that your Rabb may show Rehmat unto you; but if you revert, We shall (also) revert: And we have made hell a prison for those who reject Eimaan. (17:8)

According to the Law of Requitalthe natural consequence of wrong deeds is called *Azaab* which is the opposite of*Rehmat* i.e. development of the human self takes placeunder *Rehmat* whereas under *Azaab*its development halts and he becomes deprived ofhuman eminence. This is why the Quran has referred to*Azaab*as the antonymto *Rehmat*:

> He punishes as per His law, and He grants Rehmat as per His law, and towards Him are you turned. (29:21)

In another verse*Rehmat* is mentioned as opposite to destruction (67:28); this is because what greater punishment can there be other than destruction and annihilation? Remaining protected from dangers is also called *Rehmat* by the Quran (36:44). Similarly, to be kept protected from the troubles which come as a deluge with wars is also a *Rehmat* (48:25).

8.14 Getting Freedom from *Azaab* is *Rehmat*

Certain blunders of nations are such that they fall into the pit of degradation forever as a result and from which they cannot escape. But there are certain errors which are such that recovery can be possible from their effects (punishment). This is called obtaining

'*Najaat* after *Azaab*'. This too, has been termed as*Rehmat* of Allah i.e. instead ofsome nation being deprived of the sweetnesses of life forever, the possibility of recovery remaining in them is *Rehmat*. Hence, when Bani Israel achieved their escape from the tyranny of Pharaoh, it was declared to be Allah's *Rehmat*:

They said: 'In Allah do we put out trust. Our Rabb! make us not a trial for those who practice oppression; And deliver us by Your Rehmat from those who reject (You).' (10:85-86)

When the nation of Noah was surrounded on all sides by the *Azaab*of destruction, Noah said:

…This day nothing can save, from the command of Allah, any but those on whom He has Rehmat…(11:43)

Similarly, when *Azaab*overwhelmedother errant nations, then whichever righteous people were saved from among thesewas also called Allah's*Rehmat*(7:72, 11:58, 11:66, 11:94, 21:74-75).

8.15 Being Protected from the *Azaab* of the Hereafter is also a *Rehmat*

This was regarding*Azaab*as related to this world. The same is stated regarding *Azaab* of the hereafter:remaining protected from this is also Allah's *Rehmat*:

On that day, if the penalty is averted from any, it is due to Allah's Rehmat; and that would be a manifest achievement. (6:16) See also (3:116, 40:9, 44:41-42, 76:31)

8.16 Jannat is *Rehmat*

The people of *A'raf*(those at the heights) will say to the inhabitants of hell, look, those same people are in Jannat about whom you used to swear that Allah will not have *Rehmat* on them. Just see, they were the very ones told to enter Jannat, there is neither any fear for you and nor will you be sorrowful:

Behold! are these not the men whom you swore that Allah with His Rehmat would never bless? Enter you the Garden: no fear shall be on you, nor shall you grieve. (7:49)

Glad tidings for this very Jannat are given based on *Eimaan* and righteous deeds (9:21-22). This is evident achievement i.e. a great triumph:

Then, as to those who believed and did righteous deeds, their Sustainer will admit them to

His Rehmat that will be the achievement for all to see. (45:30)

8.17 Righteous Progeny

Now observe the great blessings of heavenly *Rehmat*on worldly life. Being bestowed with righteous progeny is by His *Rehmat*. Abraham had become hopeless about having children during his old age. At that time, Allah with His *Rehmat*fulfilled his heartfelt wish with the desired pearl. Hence,when the messengers sent by Allah gave both him and his wifethe glad tidings of offspring, she becameamazed. Upon that, they responded:

…Do you wonder at Allah's decree? The grace of Allah and His blessings on you, O you people of the house! for He is indeed worthy of all praise, full of all glory! (11:73)

Similarly,regarding the birth of Yahya it is stated:

A recital of Rehmat of your Rabb to His servant Zakariya. (19:2)

After this, the birth of Yahya is mentioned.

8.18 Continuing Resolution of Matters

For human matters to be resolved into a pleasant outcome is also Allah's *Rehmat*. Regarding the people of the Cave, it is stated:

…betake yourselves to the cave: Your Rabb will shower His Rehmat on you and will dispose of your affair towards comfort and ease. (18:16)

8.19 Finding a Righteous Companion

Finding an excellent and supportive companion in the world is also Divine *Rehmat*. It is declared about Aaron in the Quran:

And, out of Our Rehmat, We gave him (Moses) his brother Aaron, a Nabi. (19:53)

To be included in the *Jamaat* of the righteous is such a great*Rehmat* for which the famous *Anbiya*would pray. Solomon, while passing through the Valley of *Namal*, had entreated:

…And admit me, by Your Grace, to the ranks of Your righteous servants. (27:19)

8- مذہب کشمکش حیات سے فرار سکھاتا ہے۔	دین زندگی کے حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے۔
9- مذہب تقدیر کے بہانے انسان کو بے عمل بنا دیتا ہے۔	دین، اسے تقدیر شکن قوت عطا کر کے، حرکت و عمل کا شعلۂ جوالہ بنا دیتا ہے۔
10- مذہب خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات کا نام عبادت رکھ کر انسانوں کو خود فریبی میں مبتلا رکھتا ہے۔	دین، اسے وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل کا پیغام دیتا اور نظامِ خداوندی کو دنیا کے ہر نظامِ باطل پر غالب کرنے کو عبادت کی غایت بتاتا ہے۔
11- مذہب، کائنات کی ہر حسین شے پر منہ بسورنا اور نعمائے خداوندی سے اجتناب سکھاتا ہے۔	دین اعلان کرتا ہے کہ وہ کون ہے جو زیب و زینت کی ان چیزوں کو حرام قرار دے سکتا ہے، جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے (القرآن)۔
12- مذہب ہر جدت (نئی چیز) کو گناہ قرار دینے تک لے جاتا ہے۔	دین کہتا ہے کہ کل یوم ھو فی شان۔ زندگی کے تقاضے ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں اس لئے جدت طرازی عین تقاضائے حیات ہے۔
13- مذہب اپنے پیغام کے حق کی دلیل میں اسے اسلاف کا مسلک قرار دے کر بطور سند پیش کرتا ہے۔ ان کی طرف سے پیش کردہ عقائد پر ایمان بلا علم و دلیل لانے پر زور دیا جاتا ہے۔	دین انسان کی علمی اور عقلی صلاحیتوں کو جلا دینے کا موجب اور اسلاف کے مسالک کی بلا دلیل پیروی سے منع کرتا ہے۔ وہ اپنے ہر دعویٰ کو دلیل اور برہان سے پیش کرتا ہے اور عقل و تدبر سے کام لینے کی تاکید بھی۔
14- مذہب کا تصور مفاد پرست انسانوں کے ذہن کا تراشیدہ ہے۔ ان میں سبھی ملوکیت (فرعون)، سرمایہ داری (قارون) اور مذہبی پیشوائیت (ہامان) کے نمائندے باہمی اشتراک سے دوسروں کی محنت سے کمائی پر عیش کی زندگی بسر کرنے کے لئے ہر جائز و ناجائز حیلے تراش کر مذہب میں شامل کر لیتے ہیں۔ خود مترفین بن کر دوسروں کو محکوم بنا لیتے ہیں۔	دین مذہب کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسانوں کو آزادی کی دعوت دیتا ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان کو اپنا محکوم اور اطاعت گذار بنائے۔ اطاعت صرف خدا (اس کے قوانین) کی کی جا سکتی ہے اور یہ قانون سب کے لئے برابر ہونے کی وجہ سے تمام نوع انسانی کے لئے مساوات کا پیغام رکھتا ہے۔
15- مذہب اس راستے کو کہتے ہیں جو انسانوں کا وضع کردہ ہو۔	دین اس قانون یا نظام کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملا ہو۔

اس لئے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن نے نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے دین ہی کو پیش کیا ہے اور اسے ہی اسلام کا نام دیا ہے۔ لہٰذا مسلم مذہب کی نہیں دینِ اسلام کی اطاعت کرتا ہے۔

☆☆☆

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.76
ISSUE
07

Monthly
TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com Web: www.toluislam.org
www.facebook.com/talueislam/ www.youtube.com/idaratolueislam

بے خبر! تو جوہر آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے، لیکن مثال بحر بے پایاں بھی ہے

کیوں گرفتار طلسم ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکت طوفاں بھی ہے

سینہ ہے تیرا امیں اس کے پیام ناز کا
جو نظام دہر میں پیدا بھی ہے، پنہاں بھی ہے

(علامہ اقبالؒ)